دعوتی و تحریکی نقطہ نگاہ سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک نہایت اہم تالیف

"نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت"

کا انگریزی ترجمہ درج ذیل عنوان کے تحت شائع ہو گیا ہے

The Objective and Goal of MUHAMMAD S PROPHETHOOD (SAW)

صفحات ۵۶، دبیز سفید کاغذ، عمدہ طباعت، دیدہ زیب ٹائٹل، قیمت۔/۳۶

مزید برآں

امیر تنظیم اسلامی کے سیاسی افکار اور تحریکی سرگرمیوں کی تفصیل پر مشتمل

محترمہ شگفتہ احمد کا ایک تحقیقی مقالہ (بزبان انگریزی)

جسے موصوفہ نے کینیڈا کی میک گل یونیورسٹی میں ایم اے کے تھیسس کے طور پر مرتب کیا تھا

DR. ISRAR AHMAD S Political Thought and Activities

کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

صفحات ۱۶۸، سفید کاغذ، عمدہ آفسٹ طباعت، قیمت : مجلد۔/۱۰۰، پیپر بیک۔/۷۲

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے' پی ایچ ڈی' ڈی لٹ' مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد' ایم اے' ایم فل' پی ایچ ڈی'

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار' حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ | ذوالقعدہ ۱۴۱۷ھ - مارچ ۱۹۹۷ء | شمارہ ۳

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶- کے- ماڈل ٹاؤن- لاھور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ااداؤد منزل متصل شادی ہال- شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۴ روپے' فی شمارہ -/ ۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

(اس شمارے کی قیمت: ۱۵ روپے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

زیرِ نظر شمارہ فروری اور مارچ' دو ماہ کی اشاعتوں کے قائم مقام ہے۔ ماہ رمضان المبارک کی راتوں میں قرآن اکیڈمی میں نماز تراویح کے ساتھ ترجمہ قرآن کے پروگرام کی مصروفیت اور دن میں دفتر کے اوقات کار میں نمایاں تخفیف کے باعث ایک ماہ کے پرچے کا نانغہ گزشتہ کئی سالوں سے ایک روایت سی بن گئی ہے۔ تاہم اس کی تلافی کے طور پر نانغہ کے بعد شائع ہونے والے شمارے کی ضخامت بڑھادی جاتی ہے کہ قارئین کے ساتھ ناانصافی بھی ہمیں گوارا نہیں!

شمارہ ہذا میں معمول کے مضامین کے علاوہ چار صفحات پر مشتمل ایک میمورنڈم (بزبان انگریزی) بھی شامل ہے جو محترم ڈاکٹر اسرار احمد (صدر موسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی) نے ۲۳ فروری کو وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف' وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف اور ان کے والد محترم میاں محمد شریف صاحب کی خدمت میں پیش کیا جب یہ معزز حضرات محترم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ اس ملاقات اور اس کے پس منظر کی تفصیلات ۲۵ فروری کے خبرنامہ ندائے خلافت میں شائع ہو چکی ہیں' تاہم قارئین "حکمت قرآن" کے لئے اس کا اجمالی تذکرہ بے محل نہ ہو گا —— محترم ڈاکٹر صاحب نے ۱۴/ فروری کے خطاب جمعہ میں حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہوئے حالیہ انتخابات کے خوش آئند پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور بعض منفی پہلوؤں کا تذکرہ کرنے کے علاوہ "الدین النصیحہ" کے حوالے سے وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف کو احیاء اسلام اور احیاء نظام خلافت کے حوالے سے ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا تھا اور اس ضمن میں بعض معین نکات بطور مشورہ سامنے رکھے تھے۔ اس خطاب کا آڈیو کیسٹ محترم ڈاکٹر صاحب نے میاں محمد شریف صاحب (وزیر اعظم کے والد محترم) کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ ارسال کیا کہ :

"مجھے خوب اندازہ ہے کہ میاں محمد نواز صاحب یا میاں محمد شہباز صاحب کے لئے تو اس وقت یہ ممکن ہی نہیں ہو گا کہ وہ اسے سننے کے لئے وقت نکال سکیں' تاہم آپ کے خاندان میں خالص مشرقی تہذیب کے اثرات بہت حد تک باقی ہیں اور آپ کے صاحبزادے آپ کے زیر اثر ہی نہیں تابع فرمان بھی ہیں' لہٰذا میں آپ کی خدمت

(باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

سلسلۂ تقاریر تعارفِ الکتاب:

ڈاکٹر اسرار احمد

وَقَالَ الَّذِیْنَ ١٩

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ○

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ　　بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا کَبِیْرًا ○ یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (الفرقان: ٢١،٢٢)

قرآن مجید کا انیسواں ١٩ پارہ "وَقَالَ الَّذِیْنَ" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس میں اوّلاً سورۃ الفرقان کی بقیہ ستاون ٥٧ آیات شامل ہیں' پھر سورۃ الشعراء مکمل اور آخر میں سورۃ النمل کی ابتدائی انسٹھ ٥٩ آیات شامل ہیں۔ سورۃ الفرقان کا جو حصہ اس پارے میں وارد ہوا ہے اس میں وہ عظیم آیت بھی آئی ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد نقل ہوئی ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ○ (آیت ٣٠) "اور پیغمبر کہیں گے کہ اے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا"۔ اس آیت کا براہِ راست تعلق اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت سے ہے کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو بھیجا ہی اس لیے اور اسی لیے ان پر کتاب نازل فرمائی کہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کریں۔ (نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ○) لیکن جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قرآن کے ذریعے دعوت دی اور انہوں نے اعراض و انکار کی روش اختیار کی تو فریاد کے یہ الفاظ حضورؐ کی زبان پر وارد ہوئے کہ اے ربّ! میری اس قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا ہے' اس کی طرف ملتفت نہیں ہو رہی ہے' اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حواشی میں بڑی پیاری بات کہی ہے کہ اس آیت میں اگرچہ اصل ذکر کفار کا ہے لیکن مسلمانوں میں سے بھی وہ لوگ جو قرآن مجید سے بے اعتنائی برتیں' نہ اس کی طرف پڑھنے

کے لیے متوجہ ہوں اور نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، نہ اس پر عمل کرنے کے لیے کوشاں ہوں اور نہ ہی اسے دوسروں تک پہنچانے کا فرض منصبی پورا کریں تو یہ سب لوگ بھی درجہ بدرجہ اسی آیت کے حکم میں شامل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس صورت سے اپنی پناہ میں لے۔

اسی سورۂ مبارکہ میں وہ عظیم آیت بھی آئی کہ: اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (آیت ۴۳) کہ اے نبیؐ کیا آپؐ نے ان لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ معلوم ہوا شرک کی یہی صورت نہیں ہے کہ بُت کو پوجا جائے یا ستاروں کی پرستش کی جائے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے جتنے بھی تقاضے انسان کے اندر سے ابھریں ان کو بجا لانے پر کمربستہ ہو جانا بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے اور ان تقاضوں کی ادائیگی کی کون سی شکل اللہ نے جائز ٹھہرائی ہے اور کون سی صورتیں ناجائز ٹھہرائی ہیں، خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لینے کے مترادف ہے۔

سورۃ الفرقان کے آخر میں وہ آیات وارد ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ سورۃ المومنون کے آغاز میں وہ بنیادی اساسات واضح کی گئی تھیں جن پر بندۂ مومن کی شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ گویا کہ وہ اس موضوع کا نقطۂ آغاز تھا اور سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اس کا تکمیلی مرحلہ بیان ہو رہا ہے۔ ایک بندۂ مومن کی پوری طرح پختہ بنی ہوئی شخصیت کے خدوخال کیا ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

وہ پختگی کیا ہے؟ فرمایا: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (آیت ۶۳) "اور رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو انہیں وہ دور سے سلام کہتے ہیں"۔ اس پورے رکوع میں اللہ نے اپنے محبوب اور پسندیدہ بندوں کے اوصاف گنوائے اور انہیں "عباد الرحمٰن" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

اس کے بعد سورۃ الشعراء آتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں اُولُوالعزم من الرسل کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ ان میں سے قدرے تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان ہوئے پھر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ اور اس کے بعد جو ترتیب کہ عام طور پر مکی سورتوں میں ہوتی ہے یعنی حضرت نوحؑ، پھر حضرت ہودؑ، پھر حضرت صالحؑ، پھر حضرت لوطؑ اور پھر حضرت شعیب علیہم السلام۔ ان کے حالات میں خاص طور پر اسی پہلو کو واضح کیا گیا کہ یہ سب اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر آئے کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ اللہ کی پرستش کرو! اللہ کی بندگی اختیار کرو! اسی کی غلامی اختیار کرو! لیکن ان قوموں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا لہٰذا وہ نیست و نابود کر دی گئیں، انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ ہر رسول کے حالات بیان کرنے کے بعد یہ الفاظ بار بار تکرار کے ساتھ آئے ہیں: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (آیت ۶۷، ۱۰۳، ۱۲۱، ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۷۴، ۱۹۰) اس میں یقیناً ایک نشانی ہے لیکن اکثر لوگ ماننے والے نہیں تھے"۔ ساتھ ہی اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک تسلی ہے، ایک تشفی ہے کہ حضورؐ آپ بھی دل گرفتہ نہ ہوں، ان کفار کے انجام سے غمگین اور ملول نہ ہوں۔ چنانچہ آغاز ہی میں اس سورۂ مبارکہ میں یہ الفاظ آئے کہ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (آیت ۳) اے نبیؐ! کیا آپ اپنے آپ کو غم اور صدمے سے ہلاک کر لیں گے کہ وہ ایمان نہیں لا رہے! اگر وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو آپ کو غمگین نہیں ہونا چاہیے، یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں، یہ ان ہی قوموں کی روش پر چل رہے ہیں جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا رہا ہے اور اب یہ خود بھی اپنے طرزِ عمل سے اپنے آپ کو اس انجام کا مستحق بنا چکے ہیں۔

سورۃ الشعراء کے بعد سورۃ النمل وارد ہوتی ہے۔ اس میں بھی دوسری مکی سورتوں کی طرح آفاق و انفس کے شواہد، فطرت کے محکم دلائل کی بنیاد پر توحید کی دعوت، معاد یعنی آخرت کا اثبات اور نبوت و رسالت کو ماننے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت وارد ہوئی ہے۔ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا بھی ذکر ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی ذکر ہے اور ملکۂ سبا کے ساتھ جو حالات و واقعات پیش آئے ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ اس کے ضمن میں ایک عظیم آیت وارد ہوئی کہ جب ملکۂ سبا کے تخت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری نے چشم زدن میں یمن سے لا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے رکھوا دیا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے: ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (آیت ۴۰) کہ یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے۔ وہ مجھے آزما رہا ہے کہ ان احسانات اور ان انعامات پر میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا نہیں؟ یہ الفاظ وہ ہیں کہ جن کو ہم نے اپنی بدعملی سے اور بدکرداری سے بدنام کر دیا

ہے۔ چنانچہ حرام کی کمائی سے بنائی ہوئی عمارتوں پر ان الفاظ کو کندہ کراتے ہیں۔ اہتمام کے ساتھ لکھواتے ہیں: ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اس طرزِ عمل سے نعوذ باللہ من ذٰلک قرآن مجید کے یہ الفاظ ہی گویا کہ ہماری منافقت اور بدکرداری کی ایک علامت بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے اور حلال پر کاربند رہنے، حلال پر اکتفا کرنے اور حرام سے اپنے دامن کو بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

بقیہ : حرفِ اول

میں اپنی تقریر کے آڈیو کیسٹ ارسال کر رہا ہوں تاکہ اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو آپ وقت نکال کر ان کی سماعت فرمالیں۔ پھر اگر آپ کو کسی معاملے میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو اگر آپ تشریف لانے کی زحمت گوارا کر سکیں تو یہ میرے لئے موجب اعزاز ہو گا اور اگر آپ مجھے طلب فرمائیں تو میں اس مقصد کے لئے سر کے بل حاضر ہونا موجب سعادت سمجھوں گا"۔

میاں محمد شریف صاحب نے محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کے مراسلے کا اس درجے اکرام کیا کہ اپنے تینوں صاحبزادوں (یعنی میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف اور میاں عباس شریف) سمیت محترم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی تشریف لے آئے۔ اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے، قارئین میں سے جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ خبرنامہ ندائے خلافت کا متعلقہ شمارہ ہم سے طلب فرما سکتے ہیں، تاہم اس موقع پر معین نکات کی شکل میں جو یادداشت معزز مہمانوں کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، اسے قارئین کے افادے کے لئے شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔ ○○

○ ○ ○

درس ۴

حظِّ عظیم

سورۂ حٰمٓ السّجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَآئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ o نَحْنُ أَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ، وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ o نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ o وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ o وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ o وَمَا يُلَقّٰهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا، وَمَا يُلَقّٰهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ o وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ o

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيمُ! رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي o وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي o وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي o يَفْقَهُوا قَوْلِي o

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے' اترتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ غم کھاؤ اور نہ خوف' اور بشارت حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی' اور تمہارے لئے وہاں وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہاں وہ سب کچھ ہو گا جو تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہو گی اس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا بخشش فرمانے والا نہایت رحیم ہے۔ اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔ اور (ہرگز) برابر نہیں ہے نیکی اور بدی' آپ (بدی کو) دفع کریں نہایت احسن طریقے سے' تو (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) وہ شخص جس کے اور آپ کے مابین عداوت تھی آپ کا دلی دوست جیسا ہو جائے گا۔ اور یہ خوبی نہیں دی جاتی سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا۔ اور یہ اچھائی نہیں دی جاتی مگر بڑے نصیب والوں کو۔ اور اگر (کبھی) شیطان کی جانب سے تمہیں کوئی وسوسہ ورغلائے تو فوراً اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان ہدیۂ قارئین ہو رہا ہے اس کا پہلا حصہ قرآن حکیم کے چند ایسے مقامات پر مشتمل ہے جن میں انسان کی کامیابی اور نجات کی شرائط اور اس کی فوز و فلاح کے لوازم کا بیان نہایت جامعیت کے ساتھ ہوا۔ اس طرح ان مقامات کے مطالعے سے قرآن حکیم کے انسان مطلوب کی پوری سیرت و کردار کا ایک بھرپور اور مکمل نقشہ ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی جو اس حصے (جامع اسباق) کا آخری درس ہے' انسان کی تعمیرِ کردار اور اخروی نجات کے چار لازمی اوصاف کا بیان آیا ہے۔ یعنی ایمان کا ذکر بھی موجود ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی صورت میں۔ اور ایمان کے ساتھ ہی اعمال صالحہ کا بھی ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہاں "عمل صالح" ایک مرتبہ تو لفظ "استقامت" میں اور دوسری مرتبہ جوں کا توں "وَعَمِلَ صَالِحًا" کی شکل میں مذکور ہے۔ "تواصی بالحق" کے ذیل میں یہاں "دعوت الی اللہ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور آخر میں پھر "صبر" کا ذکر نہایت

اہتمام اور شدّومد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ گویا وہی چاروں مضامین جو سورۃ العصر میں بیان کیے گئے ہیں پھر ذرا مختلف پیرائے میں "آیۂ بِر" میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سے قدرے مختلف اسلوب کے ساتھ انہی چاروں مضامین کا بیان سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہوا ہے۔ اور پھر یہی مضامین ان (زیر بحث) آیات میں بھی ایک نئی شان کے ساتھ ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

اس مشابہت کے علاوہ ان چاروں مقامات میں ایک اور ربط بھی ہے اور وہ یہ کہ ان میں مضامین کا ایک تدریجی ارتقاء ہے۔ چنانچہ سورۃ العصر کو گویا BASELINE قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں انسان کی کامیابی کے کم از کم لوازم کا بیان ہے' یعنی مجرد نجات' ناکامی سے بچنے کی کم سے کم شرائط۔ پھر اس سے آگے نسبتاً بلند تر مقام سے ہمیں آشنا کیا گیا اور وہ مقامِ بِر و تقویٰ ہے جو آیۂ بِر میں ہمارے سامنے آیا۔ اس سے بھی ایک نسبتاً بلند تر منزل جس کو ہم "مقام عزیمت" سے تعبیر کر سکتے ہیں' اس کا بیان سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ یعنی "اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ" کی صورت میں۔ اور ان چاروں امور کے اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بلند ترین منزلیں وہ ہیں جن کا ذکر ان آیات مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ اس کے لئے عنوان اگر انہی آیات میں مستعمل الفاظ سے لیا جائے تو وہ "حَظٍّ عظیم" ہو گا۔ یعنی بڑا نصیبہ' بہت ہی یاور بخت۔ اور اگر قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام کے حوالے سے اس کا مرتبہ معین کیا جائے تو یہ درحقیقت مقامِ ولایت کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر ان چاروں چیزوں کی جو بلند ترین منازل ہیں ان کا ذکر ہوا۔ ایمان کی آخری منزل' اس کا لبِّ لباب اور اصل حاصل اللہ کی وحدانیت و ربوبیت پر دل کا جم جانا' ٹھک جانا اور اس پر پورا وثوق اور اعتماد قائم ہو جانا' پھر اس پر استقامتِ فکری' نظری اور عملی کا ہونا۔ اسی طریقے سے "تواصی بالحق" کا بلند ترین مقام اور اس کی بلند ترین منزل "دعوت الی اللہ" ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور جس ذات باری تعالیٰ کے سوا "الحق" کا مصداق کوئی نہیں (ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡحَقُّ) لہٰذا اس کی طرف دعوت' اس کی طرف بلانا گویا "تواصی بالحق" کی بلند ترین منزل ہے۔ اسی طرح صبر کے ضمن میں یہاں اس مقام کا بیان

ہو رہا ہے جہاں صرف مخالفتوں کا برداشت کرلینا اور لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں کا جھیل جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینا اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خیر خواہی اور بہی خواہی کا اظہار کیا جانا' اور پروردگار سے ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہ ہے صبر کی بلند ترین منزل۔ گویا کہ یہاں جن کیفیات اور صفات کا ذکر ہو رہا ہے انہیں ہر اعتبار سے انسانیت کی معراج قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان صفات کا ایک مکمل نقشہ اور مصداقِ کامل تو یقیناً ہماری نگاہوں کے سامنے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ ہے' لیکن آپؐ کے بعد اس نقشے میں فِٹ آنے والے درحقیقت وہ لوگ ہیں کہ جنہیں بالعموم اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ہے ان مضامین کا اجمالی تذکرہ' جن کا تدریجی ارتقاء ہمارے منتخب نصاب کے حصہ اول میں ہو رہا ہے۔

اب آیئے اس کے ایک ایک جزو پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ﴾ "یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے" یعنی جو پہچان لیں کہ ہمارا مالک و آقا بھی اللہ ہے' ہمارا خالق و رازق بھی اللہ ہے' ہمارا مشکل کشا و حاجت روا بھی اللہ ہے۔ ﴿ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ "پھر اس پر وہ جم گئے"۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت اتنی مشکل نہیں ہے۔ اگر انسان کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو اور عقل کسی غلط رخ پر نہ پڑ گئی ہو تو وہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اجمالی معرفت تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اللہ کو پہچاننے کے بعد اس کی ربوبیت اور الوہیت پر دل کا ٹھک جانا' یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

استقامت یہ ہے کہ انسان کو بظاہر کتنا ہی خطیر نفع یا بھاری نقصان کسی کی طرف سے نظر آرہا ہو لیکن وہ یہ یقین رکھ لے کہ میرا نافع اور ضار اللہ کے سوا کوئی نہیں" "لاحولَ ولاقوۃَ اِلّا باللّٰہ" اور "لا فاعلَ فی الحقیقۃِ وَلا مؤثّرَ اِلّا اللّٰہ"۔ تو یہ درحقیقت انسان کی کامیابی کی کڑی شرط بھی ہے اور معرفت الٰہی کی حقیقی اساس بھی۔ انسان اس عالم مادی میں عالم اسباب میں رہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات سے متأثر ہوئے بغیر چٹان کی مانند اپنے اس یقین پر جما رہے کہ اللہ ہی کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے'

اور وہی حقیقی مؤثر ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا' اور پھر اس پر انسان بالکل مطمئن ہو جائے اور اپنے معاملات اور اپنی ہر کوشش کو اللہ کے حوالے کر دے "وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ" اور یہ بات دل میں بٹھالے کہ میرے معاملات میرے اپنے ہاتھوں کی نسبت اس ذات کے ہاتھوں میں کہیں زیادہ محفوظ ہیں کہ جو "علٰی کلِّ شیءٍ قدیر" ہے' جو "بکلِّ شیءٍ علیم" ہے' وہ میری مصلحتوں سے مجھ سے بڑھ کر واقف ہے' وہ میرا مجھ سے بڑھ کر خیر خواہ ہے' تو تب اسے تعلق بندگی میں رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بے ثبات طبعی کیفیات کا محاسبہ بھی کر لے کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں ہر چیز سے فوراً تاثر قبول کر لیتا ہوں اور اپنی کم علمی کے باعث کوئی ایسی چیز پسند کر بیٹھتا ہوں جو حقیقت میں میرے لئے مضر ہوتی ہے اور کسی ایسی چیز کو برا سمجھ بیٹھتا ہوں جس میں میری حقیقی منفعت مضمر ہوتی ہے' اور اللہ ہی ہے جو ہر خیر کو جانتا ہے اور جو ہر شر سے واقف ہے۔ وہی ہے جسے قدرت حاصل ہے۔ انسان اللہ ہی کے "قدیر" ہونے پر یقین رکھے اور اپنے آپ کو اس کی بارگاہ میں یوں بے بس و عاجز تصور کرے جیسے صوفیاء کہتے ہیں کہ "کَالْمَیِّتِ فِیْ اَیْدِی الْغَسَّالِ" یعنی انسان اللہ کی رضا پر اس طرح راضی رہے اور اس کی مرضی پر اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دے جیسے کہ میت (ایک مردہ جسم) ایک غسل دینے والے کے ہاتھ میں لاچار ہوتی ہے۔ یہ ہے انسان کا اللہ کے ساتھ صحیح ربط و تعلق' اور یہ ہے وہ استقامت جو مطلوب ہے' ورنہ مجرد کہہ دینا کہ "میرا رب اللہ ہے" اتنا مشکل نہیں جتنا کہ "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ اور استقامت کے تقاضے یہ ہیں کہ عقیدہ میں' فکر میں' سوچ میں' نقطۂ نظر میں اور بدلتے ہوئے حالات میں' انسان کا دل بھر اعتبار اللہ کی ربوبیت و قدرت مطلقہ پر جما رہے۔ یہ استقامت کا ایک پہلو ہے۔

استقامت کا دوسرا پہلو عملی ہے' وہ یہ ہے کہ انسان نے جس ذات کو مالک مان لیا ہے اس کے ہر ہر اشارے پر حرکت کرے' اس کی ہر مرضی کو پورا کرنے کے لئے ساری قوت صرف کر دے۔ اس کا ہر حکم اس کے لئے واجب التعمیل ہو' اس کے اشارہ پر سب کچھ نچھاور کرنے پر بدل و جان آمادہ ہو۔ پھر انسان کی غیرت و حمیت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ

مالک کو پسند ہے اسے دنیا میں پھیلانے' رائج کرنے' غالب کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگادے' جو اسے پسند نہیں ہے بندہ بھی اسے ناپسند کرے اور ہمیشہ اس سے نبرد آزما بھی رہے اور اس کا نام و نشان مٹانے کے لئے جان اور مال نچھاور کر دے۔ یہ ہے استقامت عملی۔ گویا اگر یوں کہا جائے کہ سورۃ العصر' آیہ بر یا سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں جتنے عملی پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں وہ سب یہاں لفظ "استقامت" میں مضمر ہیں تو یہ بات بالکل بجا ہو گی۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اس لفظ استقامت میں ایک قیامت مضمر ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے جب ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضورؐ مجھے کوئی ایسی بات تعلیم فرما دیجئے کہ جس کے بعد قول و عمل کی راہ میں کسی دشواری سے دوچار نہ ہوں اور بے دھڑک راہ ہدایت پر گامزن رہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قُل آمنتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِم" یعنی "کہو میں ایمان لایا اللہ پر' پھر (عملاً) اس پر جمے رہو"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ("اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا" میں) جس بلند مرتبہ و مقام کا اور جن کیفیات کا ذکر ہو رہا ہے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اسی کو مرتبہ "ولایت" سے تعبیر کیا گیا' اس لئے کہ اس آیت میں آگے جو نوید جانفزا "اَنْ لَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا" دی جا رہی ہے قرآن مجید میں انہی الفاظ سے اولیاء اللہ کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ فرمایا: "اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُونَ ○ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَکَانُوا یَتَّقُونَ" یعنی حقیقی ایمان جنہیں میسر آگیا ہو اور جو اللہ کے تقویٰ کو فی الواقع صحیح معنوں میں اپنی شخصیتوں میں جذب کر چکے ہوں' ان لوگوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حُزن۔ یہی درحقیقت ایمان کا ماحصل ہے۔ اس لئے کہ ایمان امن سے بنا ہے' اور امن کی ضد خوف بھی ہے اور غم بھی۔ گویا ایمان دے کر غم و حزن سے انسان کو بالکلیہ آزاد اور بے نیاز کر دیا گیا ہے۔

مقامِ ولایت کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد اللہ رب العزت نے ان کے علوِّ شان کو پھر یوں بیان کیا کہ ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلَائِکَۃُ﴾ یعنی ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ "تَتَنَزَّلُ" عربی قواعد کی رو سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اور عربی میں فعل مضارع حال

اور مستقبل دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ گویا اس کا یہ ترجمہ بھی درست ہو گا کہ "اترتے ہیں ان پر فرشتے" اور یہ بھی صحیح ہو گا کہ "اتریں گے ان پر فرشتے" اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مفہوم یہاں جمع ہیں۔ ملائکہ کا نزول اس بشارت اور اس نوید جانفزا کے ساتھ ہوتا ہے کہ ﴿اَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ "نہ خائف ہو نہ غمگین ہو"۔ خوف و غم سے اب تمہیں کوئی علاقہ نہیں ﴿وَاَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝﴾ "اور خوشخبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا"۔

یہاں ایک مسئلہ مفسرین کے مابین زیر بحث رہا ہے کہ ملائکہ کے اس نزول کا وقت کونسا ہے۔ ملائکہ کے نزول کا ایک وقت تو وہ ہے جو سب کے نزدیک مُجمع علیہ ہے' وہ یہ کہ ملائکہ کا نزول بندۂ مومن پر' اللہ کے دوستوں پر' اللہ کے چاہنے والوں پر' ان کے انتقال سے متصلاً قبل ہوتا ہے جب کہ وہ اس عالم سے اس عالم کو منتقل ہونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا اس عالم کے سفیر اس عالم میں ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے اور ان کا استقبال کرنے کے لئے پہنچے ہوتے ہیں۔ یہ چیز بعض روایات سے بھی ثابت ہے اور اللہ کے نیک بندوں کے انتقال کے وقت کے بعض حالات جو متواتر سننے اور مشاہدے میں آتے رہے ہیں ان سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ اب تمہارے حزن اور خوف کا دور ختم ہوا' تمہارے رنج و محن کا دور گزر گیا۔ اس دنیا میں' جو تمہارا دار الامتحان تھا' تمہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور طرح طرح کی آزمائشیں درپیش رہیں' قسم قسم کے مسائل سے سابقہ رہا' اب تم ان تمام الجھنوں سے چھوٹ گئے۔ لہٰذا اب خوشخبری حاصل کرو کہ اس کشمکش خیر و شر اور اس معرکۂ حق و باطل میں تم سرخرو اور کامیاب ہو کر عالمِ آخرت کی طرف کوچ کر رہے ہو۔ یہ مفہوم تو بالکل واضح ہے اور متفق علیہ ہے۔

نزول ملائکہ کا دوسرا مفہوم جس کی طرف قرآن مجید کی بعض دیگر آیات سے رہنمائی ملتی ہے' یہ ہے کہ بندۂ مومن پر' اللہ کے دوستوں پر' اللہ کے چاہنے والے پر' حیاتِ دنیوی کے دوران بھی مسلسل ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ دنیا درحقیقت دار الامتحان ہے۔ یہاں خیر و شر کی ایک کشمکش اور ایک چومکھی جنگ لڑی جا

رہی ہے۔ اس چومکھی جنگ کا ایک میدان انسان کے باطن میں ہے جس میں شر کے محرکات بھی ہیں اور خیر کے داعیات بھی۔ شر کے محرکات میں وہ نفس امارہ بھی ہے جس کے بارے میں قرآن مجید خود کہہ رہا ہے "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ" کہ یہ نفس امارہ برائی کی طرف راغب کرنے اور کھینچنے والا ہے۔ لیکن اسی باطنی میدان میں خیر کے محرکات اور قلب و روح کے داعیات بھی ہیں جو انسان کو بلندی اور عالم علوی کی طرف' خیر اور بھلائی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیر و شر کی باطنی کشمکش ہے جس کا تجربہ ہر انسان کو ہے۔ گویا اس کی داخلی شخصیت کا ایک میدان کارزار ہے جس میں ہر وقت یہ جنگ جاری رہتی ہے۔

پھر یہی معرکہ خیر و شر خارج میں بھی برپا ہے۔ انسان کے خارجی ماحول میں بھی خیر کی قوتیں بھی موجود ہیں اور شر کی قوتیں بھی۔ انسانوں ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو خیر کی طرف بلانے والے ہیں۔ جیسے اولیاء اللہ ہیں' مبلغینِ حق ہیں' داعیان حق ہیں اور وہ کہ جنہیں نائبینِ رسول ﷺ کہا جائے' جو رسولؐ کے منصب تبلیغ کو اپنا کر لوگوں کو خیر اور بھلائی کی دعوت دینے والے ہیں۔ اور انسانوں ہی میں وہ بھی ہیں کہ جو شر کے داعی ہیں اور برائی کی طرف پکارنے والے ہیں۔ یہ انسان شیاطین ہیں۔ پھر غیر مرئی مخلوقات میں بھی خیر و شر کے طبقات موجود ہیں جن میں سے ایک مخلوق وہ ہے جو شر کی طرف بلاتی ہے' جو انسان کی پیٹھ ٹھونکتی ہے۔ اگر وہ بدی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ بڑھ چڑھ کر اس کی مدد کرتی ہے۔ یہ جنات شیاطین ہیں جو ابلیس لعین کی صُلبی و معنوی معنوی ذریت ہیں۔ دوسری طرف غیر مرئی مخلوق ملائکہ ہیں۔ وہ نورانی وجود رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ یہ خیر کی طرف بلانے والی اور اہل خیر کی ہمت افزائی کرنے والی ہیں اور ان کے لئے تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ چنانچہ میدان بدر میں اور معرکۂ اُحد میں ملائکہ کا نزول قرآن حکیم کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ بعض احادیث میں بھی ملائکہ کے نزول کا بڑا صریح اور صاف نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں :

((مَا جْتَمَعَ قومٌ فِی بَیتٍ مِن بُیوتِ اللّٰہِ یتلون کتابَ اللّٰہِ وَیتدارَسونہٗ بینھم اِلّا نَزَلَتْ علیھمُ السّکینۃُ

وحَفَّتهمُ الملائكةُ وغشيتهمُ الرَّحمةُ وَذكرهمُ اللّٰهُ فيمن عِندَهٗ)) (رواہ مسلم وابوداؤد والترمذی)

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور باہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوں مگر یہ کہ ان پر اللہ کی سکینت کا نزول ہوتا ہے اور ملائکہ ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں' اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لیتی ہے' اور اللہ تعالیٰ ملائکہ مقربین کی محفل میں ان کا ذکر کرتا ہے"۔

معلوم ہوا کہ ملائکہ کا یہ نزول صرف انتقال کے وقت ہی نہیں ہوتا بلکہ مومنینِ صادقین' اللہ کے دوستوں اور اس کے چاہنے والوں پر حیاتِ دنیوی کے دوران بھی مسلسل فرشتے اترتے ہیں۔ اس دوسرے مفہوم کی تائید یہ الفاظ قرآنی بھی کر رہے ہیں : ﴿ نَحْنُ اَوْلِيَاءُ كُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی "ہم ہیں تمہارے ساتھی (تمہارے رفیق' تمہارے حمایتی' تمہارے پشت پناہ) دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی"۔ یہ قول اسی صورت میں زیادہ قابل فہم ہوگا جبکہ یہ حیاتِ دنیوی سے متعلق ہو' یعنی اس وقت جبکہ انسان فی الواقع اس کشمکش میں مبتلا ہو اور معرکۂ خیر و شر میں نبرد آزما ہو' اور ایسے کڑے وقت کوئی اس کی پیٹھ ٹھونکے اور اس کی ہمت افزائی کرے کہ ہم تمہارے ساتھی اور مددگار ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس معرکے میں تنہا نہ سمجھو۔ "نَحْنُ اَوْلِيَاءُ كُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ" تو اس دوسرے مفہوم کی تائید ان الفاظ مبارکہ سے زیادہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ کی ربوبیت پر انسان کو وثوق حاصل ہو جائے اور اس پر اس کا دل جم جائے' تو یہ وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ دورانِ حیاتِ دنیوی بھی ملائکہ کا نزول اس پر پیہم ہوتا رہتا ہے جس سے اسے انبساط حاصل ہوتا ہے' اس کے قلب کو تثبیت حاصل ہوتی ہے' اسے داخلی سکون اور اطمینان میسر آتا ہے اور اس کے قدموں میں جماؤ پیدا ہوتا ہے' جیسے کہ سورۂ انفال میں فرمایا : "اَنْ ثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا"۔ میدانِ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کو اللہ کا حکم ہوا کہ "اہل ایمان

کے قدموں کو جما دو" یعنی ان کے دلوں کے اندر ایک قوت پیدا کر دو۔

رہا معاملہ آخرت کا تو اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے : ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ﴾ یعنی "وہاں تو تمہارے لئے ہر وہ چیز (مہیا کر دی گئی) ہے جس کی خواہش تمہارے جی کریں گے"۔ تمہارے نفوس کا خالق جانتا ہے کہ اس میں کس کس چیز کی اشتہا ہے' اس میں کس کس چیز کی طلب مضمر ہے' اور اللہ نے جو تمہارا خالق و مالک ہے' تمہارے نفس کے جملہ تقاضوں کی بھرپور تسکین کا اہتمام اس جنت میں کر دیا ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس پر مزید فرمایا ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ وہاں جو بھی مانگو گے' جو طلب کرو گے حاضر کر دیا جائے گا۔

"اشتہا" اور "طلب" کے مابین ایک لطیف سا فرق ہے۔ اشتہا نفس انسانی کے وہ تقاضے ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں' جنہیں مشتہیاتِ نفس کہا جاتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کی خواہش نفس کے اندر موجود ہے۔ جنت میں ان تقاضوں کی بھرپور تسکین کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں بندۂ مومن اپنے نفس کی باگیں روک کر رکھتا ہے' اللہ کے حکم کے تحت نفس کی مرغوبات سے اپنے آپ کو دور اور خود کو تھامے رکھتا ہے "اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" تو اس کا ایک منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آخرت میں ان کے ان مشتہیاتِ نفسانیہ کو بھرپور تسکین فراہم کی جائے جس پر بندۂ مومن نے حیات دنیوی کے دوران قدغنیں بٹھائے رکھیں تھیں۔ اور "طلب" یہ ہے کہ ہر انسان کی ایک فکر اور شعور کی سطح (LEVEL OF CONSCIOUSNESS) ہے۔ اس کے اعتبار سے ہر شخص کی تمنا مختلف ہوگی' ہر شخص کچھ اور چاہے گا۔ اس اعتبار سے اس جملے میں ایک امکانی کیفیت رکھ دی گئی کہ "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ" یعنی جو کچھ بھی تم چاہو گے اس کو پیش کر دیا جائے گا۔

جنت میں سب سے بڑی بات اللہ تعالیٰ کی میزبانی ہے جس پر اس ذکرِ عالی کو ختم فرمایا گیا۔ یعنی ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ﴾ "یہ اس ہستی کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی"۔ اگر خطائیں ہیں تو وہ ان سے درگزر کرنے والا ہے' اگر کہیں کوئی قدم پھسل گیا تھا تو اس کو بخش دینے والا اور معاف فرمانے والا ہے' تاکہ اجر و

ثواب میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس کی طرف سے مہمان نوازی ہو گی اور تم مہمان ہو گے۔ یہاں بخشش اور رحم فرمانے کے ذکر میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کچھ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ درحقیقت "نُزُل" ہے' یعنی پہلی اور اولین مہمان نوازی۔ اہل عرب "نُزل" کا لفظ اس مہمان نوازی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو کسی مہمان کے آتے ہی فوراً پیش کی جائے۔ گویا "نَزِیل" (نزول کرنے والا) یعنی اترنے والا جیسے ہی اپنی سواری سے اترے' اس کے سامنے ٹھنڈا یا گرم فوراً پیش کر دیا جائے۔ یہ ہے نُزُل' اور اس کے بعد اہتمام ہوتا ہے ضیافت کا۔ تو یہ سب کچھ بھی نزل کے حکم میں ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضیافت ہونے والی ہے اس کا تو کوئی تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا کہ : ((مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) "وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں' نہ کسی کان کبھی سنیں اور نہ ہی کبھی کسی انسان کے دل پر ان کا کوئی خیال یا احساس وارد ہوا"۔ وہ تو تمہارے حواس' تمہارے تخیلات سے ماوراء نعمتیں ہیں۔ باقی جو کچھ تمہارے احساس و ادراک میں آ سکتا ہے وہ نزل اور ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر عطا کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ بخشش اور رحمت کے جام تسکین و فرحت تو مہمان کو آتے ہی پیش کر دیئے جائیں گے۔ پھر ضیافت کا وہ لامتناہی سلسلہ ہو گا جس کا کوئی حساب ہے نہ کوئی حد۔

سورۂ حٰمٓ السجدہ کی زیر نظر آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں تین آیات کا بیان ہوا' جن میں مرتبہ ولایت کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے حصے کی بقیہ چار آیات میں اسی تصویر کا دوسرا رخ سامنے آ رہا ہے جس میں اصل مرکزیت "دعوت الی اللہ" اور اس راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر اور اس کی اعلیٰ ترین منزل کے بیان کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ "اس شخص سے بہتر اور کس کی بات ہو گی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو اور نیک عمل کرتا ہو"۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے اس کا بھرپور ذکر پہلے حصہ میں استقامت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ یہاں درحقیقت عمل صالح کا ذکر اسی دعوت

کی ایک ضرورت' اس کی تائید اور اس کے موثر ہونے کے لازمی تقاضے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ کا عمل بالکل غیر مؤثر رہے گا بشرطیکہ اس گواہی کے طور پر داعی کی اپنی زندگی حسن اخلاق کا ایک نمونہ نہ بن جائے۔ اگر داعی اپنی دعوت کا ایک عملی نمونہ اپنی زندگی میں پیش نہ کرے تو درحقیقت اپنی دعوت کا اولین دشمن وہ خود ہو گا۔ یہاں ("وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ" میں) دراصل "دعوت الی اللہ" کو ایک فریضہ کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ وہ لوگ جن کا ذکر ابتدائی آیات میں کیا گیا ان کے ہاں دنیوی ساز و سامان' جائیداد' مال متاع اور ظاہری چمک دمک کو پرکاہ کے برابر حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی زندگی میں ان کی بلند ترین خواہش اور تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بندگان خدا کو خدا کے ساتھ جوڑ دیں' غافلوں کو اللہ کی جناب میں لا کر جھکا دیں اور بھولے بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔ ان کی ساری عملی جدوجہد ایک ہی نقطے پر مرتکز ہوتی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خلقِ خدا کی ہدایت اور خلق کو خدا کی طرف بلانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ" میں نطق انسانی کے مفید استعمال کی طرف بھی بلیغ اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زبان ہر انسان کے پاس ہے' اس کا استعمال ہر شخص کرتا ہے۔ جو لوگ نسبتاً باصلاحیت ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی دعوت کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کنبے اور قبیلے کی فلاح کا نعرہ لے کر اٹھتا ہے' کوئی قوم اور وطن کی عظمت کا نام لے کر اٹھتا ہے' کوئی عوام کے حقوق کا نعرہ لگاتا ہے' کوئی معاشی عدل اور معاشی انصاف کے لئے جدّوجہد کرنے کا دم بھرتا ہے۔ کہیں وطن کی عظمت پر گردنیں کٹائی جاتی ہیں' کہیں اپنی قومی برتری کے لئے محنتیں اور مشقتیں کی جاتی ہیں اور ایثار و قربانی کا داعیہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس طرح نامعلوم کتنی دعوتیں دنیا میں دی جاتی ہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات اور بہترین دعوت اس شخص کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلا رہا ہو۔ اس اللہ کی طرف جو سب کا خالق و مالک ہے' جو سب کا رازق ہے' جو سب کا آقا ہے' جو سب کا حاکم ہے' جس کے حضور میں سب کو چار و ناچار حاضر ہونا ہے' جس کے ہاتھ اور قبضہ قدرت میں کُل کائنات ہے' جس کے اذن کے بغیر ایک پتّا تک جنبش نہیں کرتا

اور جو اصل "الحق" ہے (ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ) اس کی طرف دعوت تو اصی بالحق کی بلند ترین منزل ہے۔ یہ تمام دعوتوں سے بلند ترین دعوت ہے۔ بلاشبہ اس سے کم تر' نچلی سطح پر اصلاحی دعوت (REFORMATION MOVEMENT) اور محدود پیمانے پر خلق خدا کی خدمت کے کاموں کی بھی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت و افادیت ضرور ہے' مگر دعوت الی اللہ ان سب سے بلند تر' اور اعلیٰ ترین ہے۔

"وَعَمِلَ صَالِحًا" یعنی "اور جو نیک اعمال کرے" اس دعوت کا اولین اور بنیادی تقاضا داعی کی اپنی زندگی کا صالحیت سے عبارت ہونا ہے تاکہ وہ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکے کہ جس بات کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں کہ لوگو اللہ کی بندگی اختیار کرو' اللہ کی اطاعت کرو' اللہ کو چاہو' اللہ سے شدید محبت کرو' اللہ ہی کو اپنا مطلوب و مقصود حقیقی سمجھو' اس دعوت کا مجسم پیکر میں خود ہوں۔ میں نے خود اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عملاً اختیار کیا ہے۔ بالفاظ قرآنی : "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" اور "قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ" میں نے خود اللہ تعالیٰ کو اپنا محبوب بنالیا ہے اور میں تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی محبت سے اپنے دلوں کو آباد کرو۔

﴿وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ "اور وہ کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں" یعنی اس کے ذاتی تقویٰ و تدیّن اور دین پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اس میں کوئی غرور اور تکبر نہ ہو۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کوئی شئے دگر ہوں۔ وہ یہ کہے کہ میں کسی پہلو سے بھی تم سے جدا' علیحدہ' بلند تر اور اعلیٰ نہیں ہوں بلکہ میں بھی اللہ کے حضور گردن جھکانے والوں میں سے ہی ہوں۔ یہ درحقیقت ایک کلمۂ تواضع بھی ہے جو دعوت الی اللہ کی کامیابی کے لئے شرط لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ تکبر سے اسے نفرت ہے۔ چنانچہ جیسے ہی بجلی کا کرنٹ لگتا ہے تو انسان دھکا کھا کر پیچھے کی طرف گر جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی انسان کو خود پسندی' عجب' تکبر اور غرور کے آثار محسوس ہوں گے وہاں انسانوں میں بعد اور دوری ہوگی۔ لیکن جہاں کہیں تواضع اور انکساری ہوگی وہاں کشش ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی حکم دیا گیا کہ "وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ" یعنی "اہل ایمان کے لئے اپنے بازوؤں کو

(اپنے شانوں کو) جھکا کر رکھئے"۔ مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان آپؐ کے پاس آئیں تو یہ محسوس کریں کہ رسولِ رحمت ﷺ کے دل میں ان کے لئے محبت' شفقت' مودت اور رحمت موجود ہے۔ یہ دلوں کو موہ لینے والا انداز ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس میں تواضع کو بڑا دخل حاصل ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب صحابہؓ کے مابین بیٹھے ہوتے تو آپؐ کی کوئی امتیازی نشست نہیں ہوتی تھی اور بسا اوقات آنے والوں کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہوتا تھا کہ ان میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔ اگر آپؐ کہیں تشریف لے جاتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تعظیماً کھڑے ہوتے تھے تو آپؐ اس سے بھی منع فرماتے۔ آپؐ کبھی بھی اپنے لئے کوئی نمایاں حیثیت اور نمایاں مقام کے خواہاں نہیں ہوئے۔ بعض لوگوں نے اس سے بڑا عمدہ نکتہ نکالا ہے کہ آنحضور ﷺ کو دنیا میں جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی اس کا ایک بڑا واضح' محسوس اور عقل میں آنے والا سبب یہ ہے کہ آپؐ کا "نزول" بہت کامل ہے۔ آپؐ نے خالص انسانی سطح پر زندگی بسر کی' انسانوں میں گھل مل کر' ان کے اندر رل جل کر رہنا پسند فرمایا۔ اپنے لئے کوئی ایسا مقام کہ جہاں سے اترنے کے لئے انسان آمادہ نہ ہو اور اس بلند مقام سے لوگوں کو بنظرِ استحقار دیکھ رہا ہو اور لوگوں تک رسائی میں **تکلف** ہو (نعوذ باللّٰہ من ذٰلک) اس قسم کا کوئی نقشہ محمدِ عربی ﷺ کی شخصیتِ مطہرہ میں نظر نہیں آتا۔

"اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" سے ایک اور رہنمائی ہمیں یہ ملتی ہے کہ ہمارا تشخص اور پہچان صرف "اسلام" ہی ہونا چاہئے لیکن ہمارا المیہ ہے کہ امت میں جو دعوت بھی اٹھی اس کے داعی نے ابتداء تفرقے کی مذمت کرتے ہوئے خالصتاً اسلام کی دعوت دی لیکن بعد میں دعوت قبول کرنے والوں نے ایک فرقے کی شکل اختیار کر لی اور مسلمانوں سے جدا ہو گئے۔ ان کا ایک علیحدہ تشخص قائم ہو گیا۔ گویا دعوتِ دین کے لئے اس بڑی احتیاط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ جو شخص بھی اس راہ میں قدم بڑھائے' جو بھی دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اور انبیاء و رسل کے اس حق امانت کو ادا کرنے کے لئے آگے آئے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنا کوئی جداگانہ تشخص قائم نہ کرے' مسلمانوں سے کٹ نہ جائے اور مسلمانوں سے کوئی علیحدہ حیثیت اختیار نہ کرے' بلکہ جہاں

تک ہو سکے شعوری طور پر اس کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلمانوں کے ساتھ Identify کرے۔

"اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں ہمارے لئے یہ رہنمائی بھی موجود ہے کہ مختلف مسالک اور فرقوں کی طرف بلانا دعوت الی اللہ نہیں۔ دعوت الی اللہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی بندگی' اس کی کامل اطاعت' اس سے انتہائی محبت اور اس کی معرفت سے اپنا وجود منور کرو' اپنے قلوب و اذہان میں اجالا کرو' اسی کی یاد سے دلوں کو راحت و سکون آشنا کرو۔ از روئے الفاظ قرآنی : "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"۔ وہی تمہارا مطلوب و مقصود بن جائے' اسی کی رضاجوئی تمہاری زندگی کا نصب العین ہو۔ تمہارا جینا اور مرنا' تمہارا جاگنا اور سونا صرف اسی کے لئے ہو جائے' جیسے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا : "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ اس سے تمہارا وہ تعلق قائم ہو جائے کہ تم اگر کسی سے محبت کرو تو صرف اسی کے لئے' کسی سے نفرت رکھو تو اسی کے لئے۔ اسی کو دوجس کو دینے کا اس نے حکم دیا اور کسی سے روکو تو اس لئے کہ اس کو نہ دینا اللہ کو پسند ہے۔ یہ وہ بات ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی :

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ))

یعنی "جس نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ کے لئے دشمنی رکھی اور اللہ کے لئے کسی کو دیا اور اللہ کے لئے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی"۔

اب آیئے اس آیت مبارکہ کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں : ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ اس سے بہتر بات اور کس کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو' جس کی گواہی اس کا عمل دے رہا ہو' وہ خود اپنے عمل میں اللہ کا ایک مکمل بندہ نظر آ رہا ہو۔ اخلاق حسنہ کی ایک تصویر اس کے سراپا سے مترشح ہو' پھر وہ تواضع اور انکساری کے ساتھ خود اپنے آپ کو مسلمانوں ہی میں سے شمار کرا رہا ہو۔ اس کی دعوت کسی جداگانہ فرقے یا

جداگانہ مسلک کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی طرف ہو۔ یہ ہے تواصی بالحق کی وہ بلند ترین منزل جس پر نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اگر کچھ لوگ فائز نظر آتے ہیں تو وہ پاکیزہ انسان ہیں جنہیں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ کبار صوفیاء جنہوں نے اپنے گھر بار تج دیئے۔ سوچئے کہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ اجمیر میں کوئی تجارت یا کاروبار کرنے آئے تھے؟ ہرگز نہیں' بلکہ صرف اسی دعوت کی تڑپ انہیں اجمیر لائی تھی۔ اسی تڑپ کی بدولت کلمہ توحید کی صدائیں خود ان کے وجود کو سرمست اور بے خود کئے ہوئے تھیں اور دوسری کوئی تمنا ان کے دل میں سرے سے باقی نہ رہی تھی' بقول مجذوب رحمہ اللہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

ایسے اولیاء اللہ نے اپنے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ کو بسایا تھا۔ صرف اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کو انہوں نے اپنی کل سعی وجہد کا مطلوب و مقصود بنایا تھا۔ اسی کے لئے ان کا جینا تھا اور اسی کے لئے ان کا مرنا تھا۔ خلق خدا کی محبت اور ان پر رحمت و شفقت اور مودت ان کے پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ اس اعتبار سے ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ کے اس نقشے پر واقعتاً صرف اولیاء اللہ پورے اترتے نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے' جیسے کہ اس سے پہلے کے تین اسباق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حق کی دعوت خواہ کتنے ہی خلوص اور بے نفسی سے دی جائے اس کی مخالفت اور مزاحمت ضرور کی جائے گی' خواہ اس دعوت کے پیش کرنے والے ایسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں جن کی نیتوں پر شک نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں ان کے کٹر دشمن اور ان کے خون کے پیاسے بھی "الصادق" اور "الامین" کہتے تھے' جن کی شخصیت پر کوئی داغ نہ دکھا سکا اور جن کے کردار پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا' انہیں بھی شدید مخالفت بلکہ اس سے بڑھ کر مزاحمت کا سامنا

کرنا پڑا۔ آپ ؐ کے قریب ترین اعزہ آپ ؐ کی جان کے درپے ہوئے۔ ابولہب جیسا قریبی رشتہ دار آپ ؐ کا دشمن بن گیا۔ اس کی بیوی نے آپ ؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ قریش کا پورا گھرانہ آپ ؐ کے اعزہ واقارب ہونے کے باوجود دشمن بنا۔

معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دعوت واقعتاً حق کی ہو اور باطل اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ باطل کبھی بھی اسے LYING DOWN نہیں لے گا۔ اس کے باطل ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق کا راستہ روکے' حق کے راستے میں موانع و مشکلات پیدا کرے۔ یہ دو اور دو چار کی طرح کا وہ اصول ہے جس سے کہیں کوئی استثناء نہیں۔ اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استثناء نہ ہوا اور آپ ؐ کو اپنے جسم مبارک پر پتھراؤ جھیلنا پڑا' اپنے دندان مبارک شہید کرانے پڑے' اپنے لخت جگر اور انتہائی محبوب صحابہ کی جانوں کا ہدیہ بارگاہ ربانی میں پیش کرنا پڑا' حضرت مصعب بن عمیر ؓ جیسے جاں نثار اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب جیسے محبوب چچا' خالہ زاد' دودھ شریک بھائی اور ساتھ کے کھیلے ہوئے ہجولی' کی لاشیں اگر نبی اکرم ﷺ کے سامنے اس حال میں آئی ہیں کہ ناک کٹی ہوئی ہے' کان کاٹ لئے گئے ہیں' پیٹ چاک اور کلیجے کو چبالیا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے لئے یہ اٹل قانون توڑا جا سکے لہٰذا مخالفت' مخاصمت' موانع اور مشکلات اور آزمائشیں اس راہ کے سنگ میل ہیں۔ مخاطبین' جنہیں حق کی دعوت دی جا رہی ہو ان کی طرف سے استہزاء' تمسخر اور مخالفت بھی ہو گی اور ایذا رسانی بھی اور جان لینے کے درپے بھی ہوں گے اور گھر سے نکال باہر بھی کریں گے۔

اس تکلیف دہ کیفیت میں داعی الی اللہ کا مقام کیا ہو گا۔ اس کو ایک عجیب پُر حکمت قاعدہ کلیہ سے شروع کیا گیا جس سے داعی کی تربیت اور تالیف قلب کا انوکھا اور بڑا مؤثر اصول سامنے آتا ہے۔ فرمایا : ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ﴾ "(دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی" نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے۔ نیکی کی اپنی تاثیر ہے اور بدی کی اپنی تاثیر۔ اب کیسے ممکن ہے کہ یہ دونوں برابر ہو جائیں۔ "لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ" میں مبالغے کا ایک انداز حرفِ نفی "لَا" کی تکرار سے بھی پیدا کیا گیا حالانکہ بات یوں بھی پوری ہو جاتی کہ "وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ

وَالسَّیِّئَۃُ" برابر نہیں ہیں نیکی اور بدی' لیکن "لا" کو مکرر لا کر تاکید کا رنگ پیدا کیا گیا۔ "وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ" سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ نیکی کی دعوت کی راہ میں بدی ضرور آڑے آئے گی اور رکاوٹ بنے گی' مگر اس کا علاج بڑا دلنشیں تجویز فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ﴾ مخالفتوں کا جواب بڑے ہی احسن اور عمدہ طریق سے دو۔ "اَحْسَنُ" اَفْعَلُ کے وزن پر تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہترین۔ یعنی نہایت اعلیٰ اور سب سے عمدہ طور سے مخالفتوں کی مدافعت کرو' اگر تمہیں گالیاں دی جائیں تو جواب میں تمہارے لبوں پر دعا آ جائے۔ پتھروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو تو تمہاری جانب سے پھولوں کا ہدیہ پیش ہو جائے۔ تمہارے قتل کے منصوبے بنائے جائیں تو تم شب کی تنہائی میں اپنے رب کے حضور مخالفین کی ہدایت کی دعائیں مانگو۔ یہ ہے بہترین مدافعت اور "اِدْفَعْ بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ" کا اصل مفہوم۔

اس طور سے دفاع کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ ﴿فَاِذَا الَّذِی بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝﴾ "پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت (اور دشمنی تھی) ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست"۔ یعنی وہ لوگ جو کل تک تمہارے خون کے پیاسے تھے' تمہارے حمایتی' مددگار اور جاں نثار بن جائیں گے۔ سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد بن ولید جن کی وجہ سے غزوۂ احد میں ستر مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا' جنہوں نے مسلمانوں کے فتح مند ہونے کے بعد یہ دیکھ کر کہ وہ درہ جہاں محمد عربی ﷺ نے پچاس تیراندازوں کو متعین کیا تھا خالی ہو گیا ہے' پورے کوہ احد کا چکر کاٹ کر حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی اور ستر صحابہ کے خون سے دامن احد کی زمین رنگین ہو گئی' پھر وہی خالد بن ولید ہیں جو مشرف بہ اسلام ہوئے اور "سَیْفٌ مِّن سُیُوفِ اللّٰہ" کا لقب پایا اور محمد عربی ﷺ کے سچے جاں نثار بنے۔ اب جہاں حضور کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو موجب سعادت سمجھنے لگے۔

یہ طرز عمل اور "دفاعِ اَحسن" صبر کی بلند ترین منزل ہے۔ اگرچہ صبر یہ بھی ہے کہ

کوئی گالی دے اور انسان خاموش رہے۔ کوئی پتھر مارے اور انسان اس کو چپ چاپ جھیل لے لیکن یہ صبر کی ابتدائی منزل ہے۔ جبکہ یہاں جن مقاماتِ عالیہ اور جن بلند مراتب صبر کا بیان ہوا ہے ان کے اعتبار سے صبر کی اعلیٰ ترین منزل بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جائیں' پتھروں کے جواب میں لوگوں کو پھول پیش کئے جائیں اور جو لوگ تمہارے قتل کے منصوبے بنا رہے ہوں پروردگار کے حضور میں ان کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد پوری تاریخِ امتِ مسلمہ میں صبر کے کڑے معیار پر بھی کوئی لوگ پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی صوفیاءِ کبار اور اولیاء اللہ' جنہوں نے اپنے بدخواہوں کو دعائیں دیں' جن کے سینے انتہائی کشادہ تھے' جن کے دلوں میں لوگوں نے اپنے لئے شفقت و مودت اور محبت و رحمت کا دریا موجزن پایا۔ ان کی انہی کیفیات اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر نوے ہزار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح حضرت معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ سرزمین ہند میں اسلام پھیلا ہے تو انہی لوگوں کے طفیل' ورنہ بادشاہوں اور ہمارے حکمرانوں کا جو طرزِ عمل رہا ہے وہ اسلام سے برگشتہ کرنے میں تو ممد ہو سکتا تھا اسلام کی طرف راغب کرنے میں نہیں "الا ماشاء اللہ"۔ چنانچہ چند شخصیتوں کے استثناء کے ساتھ پوری ہزار سالہ تاریخ میں عظیم اکثریت کا حال یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کا موجب تو بنے ہیں مگر اسلام کی طرف دعوت دینے میں اور اس کی طرف راغب کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سارا دعوت کا کام انہی لوگوں کے طفیل انجام پایا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے۔ انہوں نے کبھی دنیوی جاہ کی حرص نہیں کی' بلکہ ان کی زندگیوں میں ایک ہی آرزو رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ خلق خدا کی ہدایت کا سامان کیا جائے۔ گویا یہ لوگ نوعِ انسانی کے لئے مجسم خیر خواہی تھے۔

اس کے بعد فرمایا : ﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ "اس مقام تک

نہیں پہنچ پاتے مگر وہی لوگ جنہوں نے صبر کیا"۔ یعنی جن میں تحمل و برداشت اور صبر کا بڑا ظرف ہوتا ہے' جو جھیل سکتے ہیں' جو اپنے نفس کے اندر اٹھنے والے طوفان کو روک سکتے ہیں' اور جو فی الواقع صبر کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ ﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝﴾ "اور نہیں پہنچ پاتے اس مقام اور مرتبے کو مگر وہی جو بڑے نصیب والے ہیں"۔ جن کا نصیبہ بڑا یاور ہے' جو بخت آور ہیں۔ یہی وہ مقام ہے اور یہی وہ الفاظ ہیں جن کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ اس مقام کو اگر "حظِّ عظیم" سے تعبیر کیا جائے تو نہایت بہتر ہو گا۔ کیونکہ یہ خود ان الفاظ کا ایک تقاضا ہے۔ اور اگر دوسرے مقامات کے ساتھ ربط و تعلق کے حوالے سے اسے "مرتبہ ولایت" سے تعبیر کیا جائے تو بھی یقیناً درست ہے۔

اب اس درس کی آخری آیت پر توجہ کیجئے ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝" یہاں متوقع سنگین خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اس اعلیٰ مقام پر پہنچ کر بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آدمی شیطان سے بالکل مامون و محفوظ ہو گیا ہے اور وہ اب کبھی آدمی کے اندر کوئی اشتعال پیدا نہ کر سکے گا' بلکہ شیطان سے اب بھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی چوک اسے شیطان کی طرف سے لاحق ہو ہی جائے اور کبھی اس کے اندرونی جذبات اشتعال میں آ جائیں۔ یعنی انسان جب تک اس کشاکش خیر و شر میں مبتلا ہے وہ شیطان سے محفوظ و مامون نہیں ہے۔ بظاہر یہ بات اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر کہی جا رہی ہے لیکن درحقیقت اصل تخاطب آپ کے جاں نثاروں سے ہے۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے والے آپؐ کے وہ امتی جو اس دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کی ذمہ داریوں کو قبول کریں ان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ" اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگ ہی جائے' کہیں جذبات میں اشتعال اور غصہ آ ہی جائے تو تم فوراً بھانپ لو کہ درحقیقت یہ شیطان کی جانب سے ایک چوک ہے۔ اب اس کا علاج اور تدارک یہ ہے کہ "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ کر اس کی پناہ میں آ جاؤ۔ "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝" "وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

وہ ہر دعا کو سنتا اور ہر اس صورتحال سے واقفیت رکھتا ہے جس میں وہ دعا کسی کی زبان پر آ رہی ہے۔ کسی پیچیدہ صورتحال میں گرفتار ہو کر اگر کبھی انسان سے خطا اور لغزش سرزد ہو جائے تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ اس خطا کا صدور کس بیچارگی کی حالت میں ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا بھی ایک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے جو کہ یوم طائف سے متعلق ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے حضور ﷺ سے یوم اُحد کے حوالے سے سوال کیا کہ کیا آپ پر یوم احد سے سخت دن بھی کوئی گزرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : "ہاں طائف کا دن مجھ پر کہیں زیادہ سخت تھا"۔ اس دن معاملہ یہ سامنے آتا ہے کہ طائف کی گلیوں میں آپؐ کا جسم مبارک لہولہان ہوا' اوباش اور بدمعاش لوگوں نے آپ پر پتھراؤ کیا' فقرے چست کئے گئے' آپ کا مذاق اڑایا گیا اور بالکل وہ صورت ہو گئی کہ جو ہمارے ہاں کبھی گلیوں میں کسی دیوانے کے ساتھ ہوتی ہے کہ بچے تالیاں پیٹتے ہوئے اور کنکریاں مارتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ یہ نقشہ تھا محبوبِ ربّ العالمین اور سیّد الاولین والآخرین ﷺ کا۔ ایک دفعہ آپ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت کے باعث بیٹھ گئے تو دو اوباش آدمی آگے آئے' ایک نے ایک طرف بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے دوسری طرف اور اٹھا کر کھڑا کر دیا کہ چلو۔ اس قدر تکلیف دہ صورتحال سے رسولِ رحمت ﷺ کو طائف کی گلیوں میں سابقہ پڑا ہے' لیکن جب آپ وہاں سے واپس آئے تو آپ نے انتہائی دلدوز اور جگر کو چیر دینے والی دعا مانگی :

((اَللّٰھُمَّ اِلَیکَ اَشکُو ضُعفَ قُوَتِی وَقِلَّۃَ حِیلَتِی وَھَوَانِی عَلَی النَّاسِ))

"اے اللہ میں تیری ہی جناب میں اپنی قوت کی کمی اور وسائل کی کمی اور لوگوں میں اپنی ذلت و رسوائی کا شکوہ لے کر آیا ہوں"۔

اس وقت مَلَکُ الجبال حاضر ہوا اور کہا : اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اور اگر آپ فرمائیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے مابین طائف کی یہ بستی آباد ہے' اور یہ لوگ جنہوں نے آپ کو ستایا ہے پس کر سرمہ بن جائیں۔ لیکن رسولِ رحمت ﷺ کی رحمتٌ لِلعالمینی پر قربان جایئے کہ فرمایا : نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی

آئندہ نسلوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرمادے۔ ایک نقشہ یہ ہے۔ لیکن ایک نقشہ وہ بھی ہے جو میدانِ اُحد میں سامنے آتا ہے کہ جب آپ ؐ پر غشی طاری ہوئی' آپ کے خود پر وہ تلوار پڑی کہ خود کو چیرتے ہوئے آپ کی پیشانی کی ہڈی میں سے گزر گئی اور اس نے آپ ؐ کے دو دانت بھی شہید کر دیئے۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ نکل گئے کہ "اللہ اس قوم کو کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبی ؐ کے چہرے کو خون سے رنگ دیا" تو فوراً وحی الٰہی نازل ہوئی اور فرمایا : "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ" (اے نبی ؐ) آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں' اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ چاہے گا تو ان کو عذاب دے گا اور چاہے گا تو اپنی نظر کرم ان کی طرف پھیر دے گا اور انہیں ہدایت اور ایمان لانے کی توفیق عطا فرمادے گا۔

اس واقعہ میں ایک رہنمائی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بڑے سے بڑے انسان سے بھی کسی وقت کوئی ایسا جملہ نکل جائے جو اس کے مقام اعلیٰ کے شایان شان نہ ہو۔ اس لئے یہ تعلیم فرمائی کہ "وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ" یعنی "اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی چوک لگ ہی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو"۔ اور "اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" میں ایک امید دلا دی گئی کہ "اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے"۔ وہ درگزر فرمانے والا بھی ہے۔ اگر کسی وقت جذبات کی شدت میں ایسا کوئی جملہ زبان سے نکل بھی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام بلند تک پہنچنے کی ایک سچی آرزو دل میں پالنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین ○○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآن کریم اور عبادت گاہوں کا تحفّظ

اور مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وہ تقریریں جو فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف ہندوستانی پارلیمنٹ کے اندر ہوئیں ان کی جرات و صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مولانا عثمان فارقلیط کی بے باکانہ تحریریں جو اخبار الجمعیۃ کے صفحات کے ذریعے ملک کے کونہ کونہ میں حوصلہ' ہمت اور جوش ایمانی پیدا کر رہی تھیں اور یہ تمام آوازیں مولانا آزاد رحمہ اللہ کے عزم و حوصلہ سے روشنی حاصل کر رہی تھیں۔ اور یہ بھی مولانا آزاد کے ایمانی شرح صدر کا نتیجہ تھا کہ ایسے نازک مرحلہ پر بھی ان رہنماؤں کے اندر ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کی طرف مایوسی کی لہر پیدا نہیں ہوئی' کیونکہ وزارت تعلیم کے ذریعے حکومت کے ایوان خاص میں مولانا ابوالکلام آزاد خیمہ زن تھے جو ایک طرف ہندو فرقہ پرستی کے لئے تیغ براں تھے تو دوسری طرف غلو پسند اور تملق شعار مسلم قوم پرستوں کے حق میں انتباہ شدید تھے۔

قرآن کریم اور پیغمبر اسلام محمد ﷺ پر آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے' اس میں صرف مسلم معاشرہ اور ایمان والوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا مقصد سامنے رہا ہے۔ بہت کم ایسی دینی کتابیں ملتی ہیں جو غلط فہمیوں میں گھرے ہوئے غیر مسلموں کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے قریب لانے اور مذہب حق کا گرویدہ بنانے کے بنیادی دعوتی مشن کے ذہن سے وجود میں آئی ہوں اور ان کے مصنفین کا قدم اسلاف کبار کے قائم کردہ دائروں سے باہر بھی نہ نکلا ہو۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن پر اگر

غور کیا جائے تو وہ خالص دعوتی اور تبلیغی نصب العین کی ضرورت پر پوری اترتی ہے۔ تعصب و تنگ نظری میں ڈوبا ہوا غیر مسلم ذہن بھی اگر اس کا مطالعہ کرے تو وہ اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

مولانا آزاد نے قرآن کریم کی نازک سے نازک آیت کو واضح کرتے ہوئے اس مقصد کو سامنے رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ قرآن "هُدًى لِّلنَّاس" ہے' تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا پیغام ہے' صرف "هُدًى لِّلْمُؤْمِنِينَ" (مسلمانوں کے لئے ہدایت) ہی نہیں ہے' اسی طرح صاحب قرآن رسول اللہ ﷺ کو "رحمةً لِلعالمين" اور "كافةً لِلنّاس" قرار دیا گیا ہے۔ یعنی سب کے لئے رحمت اور سب کے لئے کافی۔ جس صاحب قلم اور خطیب کے ذہن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا یہ عمومی مقام ہو گا وہ انسان کی خیر خواہی اور تالیف قلوب کے احساسات سے معمور ہو کر زبان اور قلم کو حرکت دے گا۔

سیاسی انقلاب کا قرآنی فلسفہ

آزادی رائے کے حق کے بعد قوم و مذہب کی عبادت گاہوں کے لئے آزادی اور حفاظت کا حق بھی ضروری ہے' کیونکہ عبادت گاہیں عقیدہ و مذہب کا نشان ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس بنیادی مذہبی حق کو بڑے عجیب پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں بتایا گیا کہ قانون قدرت کے تحت اگر ایک گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو سیاسی اقتدار سے محروم کرنے کا سلسلہ جاری نہ رہتا تو تجارت گاہیں اور کارخانے' کھیت اور کھلیان کے مرکز ہی تباہ و برباد نہ ہوتے رہتے بلکہ کمزور قوموں کی عبادت گاہیں بھی بربادی سے محفوظ نہ رہتیں' اس لئے یہ سیاسی انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ایک قوم و جماعت کو اقتدار کا ٹھیکہ دار اور دائمی مالک نہیں رہنے دیا جاتا۔

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ

عَزِیزٌ ۝

ترجمان القرآن میں آیت مذکورہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"(اور دیکھو) اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں' گرجے' عبادت گاہیں' مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کرے گا تو ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں' وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے!"۔

(ترجمان جلد دوم' ص ۵۱۱)

تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"اس کے بعد واضح کیا گیا کہ یہ (قوت سے دفاع) مظلوموں کا قدرتی حق ہے اگر وہ اس حق سے محروم کر دیئے جائیں تو دنیا میں انسانی ظلم و استبداد کی مدافعت کا کوئی سامان باقی نہ رہے' جس گروہ کی بن پڑے دوسرے گروہ کے اعتقاد و عمل کی آزادی ہمیشہ کے لئے پامال کر دے۔ چنانچہ فرمایا' یہاں اللہ نے ایک جماعت کے ہاتھوں دوسری جماعت کے ظلم و تشدد کو دفع کرانے کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ مدافعت بعض ببعض نہ ہوتا' تو دنیا میں خدا پرستی کا خاتمہ ہو جاتا' کسی گروہ کی عبادت گاہ انسانی ظلم و استبداد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہتی"۔ (ایضاً)

مولانا آزاد نے قدرت کے دفاعی عمل کو جہاد اسلامی کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ عام رکھا۔ مولانا آزاد نے اس آیت کے سیاق و سباق کے ساتھ انسانی تاریخ پر بھی نظر رکھی۔ انسانی تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ ایک قوم کو سیاسی اقتدار سے ہٹانے کے لئے قدرت کبھی ایمان والی جماعتوں سے کام لیتی ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک کم مجرم قوم کے ذریعے بڑی مجرم قوم کے سیاسی اقتدار کو ختم کرا دیا جاتا ہے۔ مالک بن دینار تابعی کا قول ہے کہ میں نے تو مذہبی کتابوں میں یہی پڑھا ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ پہلے ایک ظالم جماعت کے ذریعے ظالم جماعت کا اقتدار ختم ہوتا ہے اور پھر اس ظالم جماعت کو نیک جماعت کے ہاتھوں ہٹا دیا جاتا ہے۔

تاریخ انسانی کے علاوہ مولانا آزاد کے سامنے سورۂ انعام کی وہ آیت بھی ہے جس میں قرآن کریم نے یہ بات صاف کردی کہ مذہبی آزادی کی حفاظت کے لئے ضروری نہیں کہ اہل حق ہی سے خدا تعالیٰ دفاع کا کام لے' بلکہ یہ کام قدرتِ الٰہی ظالموں سے بھی لے لیتی ہے :

﴿ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ﴾ (الانعام : ۱۳۰)

"وہم چنیں مسلط مے کنیم بعض ستم گاراں را بر بعض بشامت آنچہ مے کردند"

یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے اور یہی مفہوم مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

(اور دیکھو) اس طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کردیتے ہیں ان کی اس کمائی کی وجہ سے جو وہ (اپنی بداعمالیوں سے) حاصل کرتے رہے ہیں"۔

اسی مفہوم کو سورۂ بقرہ میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :

﴿ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ﴾

(آیت ۲۵۱)

"اگر خدا تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے اقتدار سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین میں فساد برپا رہتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے"۔

آیت بالا (الحج : ۴۰) میں انقلاب و تبدیلی میں اقتدار کی عام مصلحت بیان کی گئی ہے اور وہ مذہبی آزادی کی حفاظت ہے۔ عبادت گاہوں کے تحفظ سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس مفہوم میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مولانا آزاد کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی نے اس آیت کی تشریح میں عموم کا مفہوم اختیار کیا ہے اور "الجہاد" نامی کتاب میں قرآن کریم کے چار لفظوں صوامع' بیع' صلوات اور مساجد کی تشریح میں لکھا ہے :

"صَوَامِعُ سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے' مجوسیوں کے معابد اور صابئین کے عبادت خانے ہیں اور بِیَعٌ کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں' یہ جامع الفاظ لانے کے بعد پھر صَلَوَاتٌ کا ایک جامع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق ہر موضع عبادت پر ہوتا ہے"۔ (صفحہ ۱۹)

اوپر مولانا آزاد نے بھی صَلَوَات کا ترجمہ عبادت گاہیں کر کے اس کے عموم میں ہر مذہبی گروہ کی عبادت گاہوں کو شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا مودودی صاحب کو مولانا آزاد کا معنوی خلیفہ قرار دیا ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اسلام کے اجتماعی فکر کی جس جذبہ و جوش کے ساتھ مجتہدانہ انداز سے مولانا آزاد نے دعوت دی اس کے خدو خال کی تکمیل کرنے والوں میں مولانا مودودیؒ سب سے آگے نظر آتے ہیں' لیکن ان دونوں مصلحین نے نظر و فکر کے دور سے گزر کر جب عملی دور میں قدم رکھا تو دونوں ہی کو اھونُ البلیّتین کے فقہی قاعدہ نے جوش و جذبات اور عزم و عزیمت کی جگہ رخصت کے مقام پر پہنچا دیا۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ان دونوں مفسرین کے علاوہ دوسرے علماء تفسیر نے اپنی نظر کو صرف آیت کے سیاق و سباق تک محدود رکھا۔ اس جماعت میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مفتی محمد شفیعؒ جیسے دو بڑے فاضل بزرگ شامل ہیں۔ اب دیکھئے کہ اس طرز فکر کا نتیجہ کیا نکلا؟ مولانا دریا آبادی کے الفاظ حسب ذیل ہیں :

"خوب خیال رہے کہ پرانی عبادت گاہوں کے سلسلہ میں ذکر مندروں' شوالوں اور ٹھاکردواروں کا نہیں' بلکہ صرف انہی کا آنے پایا ہے جو بعد کو عملاً جیسے کچھ بھی ہو گئے ہیں لیکن اصلاً بہرحال توحیدی مذہب تھے"۔ (تفسیر ماجدی' ص ۶۸۶)

مولانا آزاد نے کتنی بالغ نظری سے قرآن کریم کی تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے ذہن میں یہ موجود تھا کہ اس آیت کو اگر صرف مقامی سیاق و سباق تک محدود رکھا گیا اور انسانی تاریخ' رسول پاک ﷺ اور آپ کے جانشین خلفاء کے طرز عمل کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو اس سے آیت قرآنی کی حقیقی روح ختم ہو جائے گی اور ساتھ ہی اسلام کے اہم بنیادی اصول (آزادی مذہب) کی ساری عمارت منہدم ہو جائے گی۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے دریا آبادی صاحب کے الفاظ اس طرح دہرادیئے ہیں :

"ان مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی' جیسے آتش پرست مجوسی یا بت پرست ہندو کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے"۔

(معارف القرآن جلد ۲' ص ۲۷۰)

یہ بڑے جلیل القدر اہل علم ہیں' جن کی رائے ماحول سے زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہے' کیونکہ حسب ذیل حقائق اس طرز فکر کی مکمل تردید کرتے ہیں :

۱۔ محقق علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندو مذہب آج جس حالت میں بھی ہو' اصل کے اعتبار سے یہ توحیدی مذہب ہے' اور ان کی عبادت گاہیں بھی اصل کے لحاظ سے توحیدی عبادت گاہیں ہیں۔ موجودہ شکل صنم خانوں کی ہے جس طرح کیتھولک مسیحی طبقہ کے گرجا مسیح اور مریم کے صنم خانے بن گئے ہیں۔

مشہور عرب مورخ البیرونی (وفات ۴۲۱ھ) نے کتاب الہند میں اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (وفات ۱۲۳۶ھ) اور حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ہم عصر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے نہایت تحقیق کے ساتھ ویدوں میں توحید کی تعلیم کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن چشتی (وفات ۱۰۹۴ھ) سنسکرت زبان کے فاضل تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی قدیم کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا اور مرآۃ المخلوقات فارسی زبان میں لکھی اور اس میں ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی کتاب "اتر کھنڈ ان پڑان" کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس میں ہندوؤں کے قدیم رشیوں کے کلام سے رسول اکرم ﷺ کے آنے کی بشارت ثابت کی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ کی طرف سے "بشارت مہادیو اور اسلام" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی طرح مولانا عبدالعزیز صاحب (وفات ۱۹۱۱ء) نے "بشارات احمد" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں ویدوں کے وہ سنسکرت اشلوک اردو رسم الخط میں تحریر کئے اور یہ ثابت کیا کہ ویدوں کی تعلیمات میں اب تک بھی توحید کی تعلیم اور رسول آخر الزمان ﷺ کے رسول آخری ہونے کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

یہ بات الگ ہے کہ قرآن کریم نے صرف دو منسوخ مذہبوں کا ذکر کیا ہے' یعنی یہود و نصاریٰ کے مذہبوں کا۔ حضرت مرزا صاحب نے وضاحت سے لکھا ہے کہ ان دو مذہبوں کے علاوہ دوسرے منسوخ مذاہب بھی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں کیا گیا۔

۲ ۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب فارس کو فتح کیا تو آتش پرست مجوسیوں کے عبادت خانوں (آتش کدوں) کو ہاتھ نہیں لگایا' حالانکہ مجوسی فرقہ کا قرآن کریم میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں صابی فرقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور یہ فرقہ ستاروں کے نام پر بنائے ہوئے بتوں کی پرستش کرتا تھا اور ان کے عبادت خانوں میں صنم پرستی ہوتی تھی۔ بعض اکابر تابعین نے قرآن کے لفظ صَوَامِع میں صابی فرقہ کی عبادت گاہیں شامل کی ہیں"۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۵ ص ۱۶۳)

محمد بن قاسم کے ساتھ بصرہ اور عراق کے جید علماء اور فقیہ صاحبان ہندوستان آئے انہوں نے ہندوستان کے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو اہل کتاب کی عبادت گاہوں کی مثل قرار دے کر ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی اور اسی شرعی ذمہ داری کے تحت ہندوؤں کے معابد' منادر و شوالوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "عرب ہند تعلقات" نامی کتاب میں تاریخ بلاذری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہندوستان کے عبادت خانوں کو یہود و نصاریٰ اور مجوس کی عبادت گاہوں کی طرح قرار دیا گیا۔ (معارف اعظم گڑھ مارچ ۶۵ء)

۳ ۔ قرآن کریم (الانعام : ۱۰۷) میں غیر مسلم قوموں کے مذہبی پیشواؤں کو جنہیں وہ پوجتے ہیں' برا کہنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس میں کسی عالم نے یہ قید نہیں لگائی کہ ان پیشوایان کفر کا تعلق قرآنی اہل کتاب سے ہو یا ان کا اصلاً تعلق وحی و نبوت کے ساتھ رہا ہو۔ پھر عبادت گاہوں کے تحفظ میں کسی قسم کی شرط لگانے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

ہم مسلمان اہل قلم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اس قسم کی دل آزارانہ تحریروں کا اثر غیر مسلم حلقوں تک نہیں پہنچتا بلکہ ہماری آواز ہمارے مدرسوں اور مسجدوں تک محدود رہتی ہے۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے۔

ایک دفعہ یہ خاکسار پروفیسر مدھوک صدر جن سنگھ سے ملاقات کرنے اور ان سے

مذہبی مسائل پر بات کرنے ان کے گھر پہنچا۔ مدھوک صاحب سے اسلام کے جہاد' جزیہ اور دارالحرب جیسے مسائل پر گفتگو کی گئی اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ مدھوک صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پروفیسر ہیں۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ مدھوک صاحب کا مطالعہ اسلامی معلومات کے سلسلہ میں کافی وسیع ہے لیکن ان کے مطالعہ میں وہی کتابیں رہتی ہیں جن میں مناظرانہ اور جارحانہ انداز سے جہاد اور جزیہ کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ مولانا ابوالکلام کی تفسیر ترجمان القرآن کا گہرا مطالعہ کریں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا۔

بابری مسجد تحریک کے موقع پر ڈاکٹر سبرامنیم سوامی جیسے لیڈر نے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ مسلمان ہندوستان کو دارالحرب کہتے ہیں اور دارالحرب کو تلوار سے فتح کرنا ان کے نزدیک مذہبی فرض ہے۔ یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہے--- مولانا آزاد نے اسی ماحول کو سامنے رکھا ہے۔

بقیہ حواشی "قرآن کی فکری و فنی عظمت"

خلکان نے اپنی وفیات الاعیان میں اس کے زندقہ کا تذکرہ کیا ہے۔ رہی بات المعارضہ للقرآن لکھنے کی تو اس سلسلے میں کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

{۱۶} واٹسن' "محمد ہز لائف اینڈ ڈاکٹرن" ص ۱۴۳

{۱۷} وحید الدین خان' علم جدید کا چیلنج' ۱۹۶۵ء' ص ۱۴۷۔۱۴۸

{۱۸} حمد بن محمد الخطابی' بیان اعجاز القرآن' طبع اول' ۱۹۵۳ء' قاہرہ' ص ۳۲

{۱۹} کارلونالینو' تاریخ آداب العربیہ' (جامعہ مصریہ میں دیئے گئے لیکچرز کا مجموعہ) قاہرہ۔ ص ۸۲

{۲۰} پی کے حتی' ہسٹری آف دی عربس' طبع ششم' ۱۹۵۸ء' نیویارک' ص ۱۲۷

{۲۱} گولڈ زیہیر' اے شارٹ ہسٹری آف عربک لٹریچر' ص ۱۹

{۲۲} جرجی زیدان' تاریخ التمدن الاسلامی' ج ۲ (ترجمہ) ص ۱۷۵

{۲۳} رینالڈ اے نکلسن' اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس' ۱۹۶۹ء' کیمبرج یونیورسٹی پریس' ص ۱۴۳

{۲۴} شمس کنول (مدیر) گگن۔ مذاہب عالم نمبر' ۱۹۸۲ء' ص ۴۱۴

{۲۵} ایضاً

صلیبیوں اور صہیونیوں کی قرآن دشمنی

"پرانے جال' نئے ہتھکنڈے' بدلتے طریق واردات"

ایک جائزہ

——— پروفیسر حافظ احمد یار

اگر ہم اسلام کے سابقونِ اولون کے قبول اسلام کے واقعات پڑھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جو عوامل لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت اور دعوت اسلام کی حقانیت اور صداقت کا قائل کر کے شرح صدر کے ساتھ دائرہ اسلام میں لانے کا موثر باعث بنے' ان میں سرفہرست دو عامل تھے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور پاکیزہ کردار ——— دوسرا قرآن کریم کا بلند پایہ ادبی اسلوب اور اس کی فطری تعلیمات۔

اور عصر نبوت سے لے کر آج تک یہی دو عامل ——— محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن ——— سعید روحوں کو اسلام کی طرف لانے کا باعث بنتے رہے ہیں۔ اور اس حقیقت کی تصدیق آج بھی ایشیا اور افریقہ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے بہت سے پڑھے لکھے اشخاص کے قبول اسلام کے واقعات سے ہوتی ہے۔ (۱)

غالباً اسلام میں قرآن اور پیغمبر ﷺ کی اس مرکزی اہمیت کی بناء پر ہی دشمنان اسلام نے ہمیشہ ان دو ——— اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب ——— کو ہی اپنے معاندانہ شبہات و اعتراضات اور جاہلانہ تعصبات و خرافات کا ہدف بنایا ہے۔

عصر نبوت خصوصاً مکی دور میں معاصر کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور سیرت پر تو کہیں انگلی تک رکھنے کی پوزیشن میں نہ تھے کہ نبوت سے پہلے سب آپ کو صادق اور امین کا لقب دے چکے تھے۔ تاہم نبوت اور دعوت اسلام کے بعد انہوں نے

آنحضور ﷺ کو شاعر' کاہن' مسحور' مجنون' کذاب اور مفتری تک کہنے اور مشہور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ـــــــ اور خود قرآن کریم کو اساطیرالاولین (دیو مالائی کہانیاں) کاہنانہ سجعات' شاعرانہ تخیلات و تعلیات اور خود ساختہ یا آموختہ افتراءات ہی سمجھتے اور کہتے رہے۔ بلکہ قرآن میں اپنی مرضی کی بعض تبدیلیوں کا مطالبہ کرنے کے علاوہ شعور و غوغا اور ہنگامہ آرائی کے ذریعے قرآن کی دعوت ـــــــ بلکہ عبارت تک ـــــــ کو لوگوں کے کانوں تک پہنچنے میں رکاوٹیں بھی ڈالتے رہے' پیغمبر خدا اور قرآن کے خلاف معاصر کفار کی ان معاندانہ باتوں اور مخالفانہ کوششوں کا ذکر خود قرآن کریم میں متعدد جگہ کیا گیا ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ ان ہی میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو گزشتہ چودہ سو برس سے دشمنان اسلام عبارات و الفاظ اور اسالیب بیان بدل بدل کر دہراتے چلے آئے ہیں۔

عہدِ نبوی کے اختتام تک اندرون عرب طاقتور یہودی قبائل اپنے اسلام دشمن سازشی کردار کے باوجود (بلکہ اسی کے باعث) مغلوب ہو چکے تھے اور اس وقت کی سب سے بڑی صلیبی حکومت ـــــــ بزنطینی رومی امپائر ـــــــ کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور آگے چل کر خلافت راشدہ کے آخر تک اس بزنطینی سلطنت کے بیشتر ایشیائی اور افریقی مقبوضات اسلامی حکومت (خلافت) کے زیر نگیں آ گئے تھے اور بچی کھچی بزنطینی (مسیحی) حکومت بھی دفاعی پوزیشن میں آ گئی تھی ـــــــ دوسری طرف ایران کی (مجوسی) شہنشاہیت (جو صدیوں بزنطینی سلطنت کے مدمقابل دوسری عالمی طاقت رہی تھی) کا بھی نام و نشان مٹ گیا اور اس کے تمام علاقے بھی اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے۔

اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام عرب سے نکل کر ایرانی (مجوسی) اور بزنطینی (صلیبی) سلطنتوں کے ان سابقہ مقبوضات (جو اب اسلامی مفتوحہ علاقے بنے) میں اس تیزی اور قوت سے پھیلا کہ جزیرہ نمائے عرب کے بعد یہی خطے آج تک مسلم اکثریت کے علاقے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرکز چلے آتے ہیں۔

اسلام کے سیاسی غلبہ کے اس اولین دور میں مجوسی' مسیحی اور یہودی عناصر اسلام کے خلاف کسی جارحانہ اقدام سے عاجز رہ گئے تو ان میں سے بعض نے بظاہر اسلام کا لبادہ

اوڑھ کر' مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے نت نئے جال پھیلانا شروع کر دیئے' جن کا مقصد مسلمانوں کی صفوں میں سیاسی افتراق و انتشار کے بیج بونا تھا ـــــ جس کی ایک مثال (بظاہر نو مسلم) یمنی یہودی عبداللہ بن سبا کی وہ شیطانی چالیں تھیں' جن کے نتائج بالآخر خلافت راشدہ کے آخری دور میں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

پھر جب اس افتراق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف سیاسی گروہوں ـــــ شیعہ' سنی' خوارج وغیرہ ـــــ نے مذہبی فرقوں کی شکل اختیار کی تو اختلافات میں جذباتی شدت پیدا ہونے لگی ـــــ اور اس کے ساتھ ہی مختلف مذاہب و ملل کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو دانستہ یا نادانستہ' شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے سابقہ معتقدات و خیالات کے اثرات بھی ساتھ لائے اور یوں نئے فتنوں کے دروازے کھلنے کا سبب بننے لگے۔ مثلاً :ـــــ

مجوسی زندقیت اور باطنیت نے زیادہ تر قرآن کے متشابہات کی فتنہ انگیز تاویل کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے موزوں پایا۔ اور یہودی و مسیحی عناصر نے اپنے سابقہ "علم کتاب" کی آڑ میں قرآن مجید کے مجمل کی تفصیل کے لئے اسرائیلیات کو رواج دینا شروع کیا۔

اور باہم مخالف و متضاد نظریات کے حاملین نے اپنی اپنی تائید کے لئے اگرچہ عموماً قرآن ہی کی آیات سے دلائل ڈھونڈنے کے لئے ایک حرج سے تحریف معنوی کا سہارا لیا ـــــ تاہم حفاظت متن قرآن کا جو نظام بذریعہ حفظ قرآن عہد نبوت سے اور بذریعہ رسم قرآن عہد عثمانی سے قائم ہو چکا تھا ـــــ جس پر ابھی آگے کچھ مزید بات ہو گی ـــــ اس نظام کی وجہ سے ایسے لوگوں کے لئے ـــــ اپنے مزعومات کے مطابق ـــــ قرآن میں کسی قسم کی تحریف لفظی کی نقب لگانے کی گنجائش بلکہ امکان تک نہ تھا۔ اس لئے اس مقصد (تائیدی دلائل کے حصول) کے لئے ایسے عناصر پیغمبرؐ اور صحابہؓ کی طرف منسوب روایات بھی گھڑنے لگے' یعنی وضع حدیث کا کام بھی شروع ہو گیا۔

نئے مسلمان ہونے والے لوگوں میں زیادہ تر عربی زبان کی اس مہارت اور طبعی

ذوق سے محروم تھے جو قرآن کے مخاطبین اولین کا طرۂ امتیاز تھا۔ عربی زبان کے اس "نیم پختہ" علم کی وجہ سے اور اپنے اندر کے پوشیدہ فساد انگیز جراثیم کے زیر اثر نصوص کے صحیح فہم سے قاصر رہ کر یا تو ان نصوص پر اعتراض کرنے لگے اور یا پھر ان نصوص کو من مانے معنی پہنانے لگے۔

اس طرح مختلف اسباب و عناصر اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے ـــــ بلکہ دین کی اصل بنیاد یعنی خود قرآن کریم کو طعن و تشکیک کا ہدف بنانے کی راہ ہموار کرنے لگے۔

اور اگرچہ علمائے حق کی ایک کثیر تعداد نے ہمیشہ ایسے لوگوں کی مفسدانہ تاویلات' موضوع روایات' ہر قسم کے اعتراضات و شبہات اور باطل مزعومات کے عقلاً نقلاً مدلل علمی اور کافی و شافی جواب دے کر اتمام حجت کر دیا ہے [۲] تاہم فلسفہ کذب و افتراء اور فن افواہ سازی کے اس اصول کے تحت کہ "بکثرت جھوٹ پھیلاؤ۔ ہر ایک جگہ اور ہر ایک کے آگے پھیلاؤ۔ تمہارے جھوٹ کو باور کرنے والے کچھ لوگ مل ہی جائیں گے' ورنہ کم از کم سچ اور حقیقت کے بارے میں شک و شبہ تو ضرور پیدا ہو گا"۔ ویسے بھی بقول کسے "جھوٹ آدھی دنیا کا سفر طے کر لیتا ہے جبکہ سچ ابھی تسمے باندھ رہا ہوتا ہے" ـــــ اس اصول کے تحت دشمنان اسلام و قرآن ہمیشہ ایک ہی قسم کی باتوں کو بار بار اور بکثرت تکرار کے ساتھ نت نئی مغالطہ آمیزی (fallacy) اور وسوسہ انگیز دلیل بازی (sophistery) کے ذریعے کم علم اور ضعیف الایمان لوگوں کو ذہنی خلفشار اور نفسیاتی قلق و اضطراب میں مبتلا کر کے راہ حق سے گمراہ کرتے چلے آئے ہیں جس کا کچھ تذکرہ آگے آئے گا (اور دراصل تو یہی ـــــ تذکرہ اور جائزہ ہی ـــــ زیر نظر سطور کا مقصد تحریر ہے)۔

مختلف سیاسی گروہ بندیوں اور دیگر عوامل کی وجہ سے (جن کی طرف ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ہے) امت میں فتنہ و گمراہی اور سازشوں کے نت نئے دروازے کھل جانے کے باوجود ـــــ ابتداء میں اسلامی حکومت اور معاشرے کے دبدبے کی وجہ سے (کم از کم پہلی صدی ہجری کے آخر تک) کسی کو قرآن پر کھلم کھلا زبان طعن کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر جب ایسے حکمران آئے جن کی ترجیحات میں کرسی یا اقتدار کو اولیت اور دین و

قرآن کو ثانوی حیثیت دی جانے لگی تو قرآن پر طعن کرنے والوں کے حوصلے بڑھنے لگے۔ غالباً قرآن کریم پر کھلم کھلا زبان طعن دراز کرنے والا پہلا شخص الجعد بن درھم (ت ۱۲۴ھ) تھا جو آخری اموی خلیفہ مروان الحمار (ت ۱۳۲ھ) کا اتالیق بھی رہ چکا تھا اور کچھ عرصہ عراق کا گورنر بھی رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص طالوت نامی کسی یہودی کی صحبت بد سے متاثر تھا اور اس کی گمراہیوں میں سے نمایاں بات یہ تھی کہ اس نے قرآن کے معجزہ ہونے کا انکار کیا اور کہا قرآن جیسی کتاب (بلحاظ زبان و اسلوب) لکھنا ناممکن نہیں۔ {۳}

عباسی دور میں تفرقہ اور فرقہ واریت بہت بڑھ گئی اور کلامی تنازعات کی گرمی انتہا کو چھونے لگی۔ امت کئی فرقوں میں تو بٹ ہی گئی تھی' ہر فرقہ میں سے بھی متعدد گروہ فرقہ در فرقہ کی صورت میں برآمد ہوئے۔ مثلاً معتزلہ کے تیس کے قریب گروہ' شیعہ کے بائیس کے قریب گروہ اور خوارج کے سات سے زیادہ گروہ بن گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک گروہ دوسرے فرقوں کے علاوہ خود اپنے ہی فرقہ کے دوسرے گروہوں کی تکفیر بھی کرتا تھا۔ ان فرقوں اور ان کے گروہوں کے بارے میں تفصیلات "الملل والنحل" کی قسم کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان مختلف گروہوں اور فرقوں نے اپنی اپنی اغراض کے لئے قرآن کریم کو بھی طعن و تشکیک کا نشانہ بنایا۔ مثلاً شیعہ کے بعض غالی گروہوں نے قرآن میں تبدیل و تحریف اور کمی یا زیادتی کی باتیں کیں {۴} اور جن کا بہت سے اہل علم امامیہ نے انکار کیا ہے {۵}۔ خوارج کا ایک گروہ (جن کو عجاردۃ کہتے ہیں) سورۂ یوسف کو قرآن کا حصہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس طرح بعض ملاحدہ اور اہل زیغ کو قرآن کریم میں "لحن" (لغوی یا نحوی اغلاط) اور بعض کو کاتبوں کی "لغزشیں" نظر آنے لگیں ـــــ اور اس مقصد کے لئے ایسی خود ساختہ روایات تراشی اور پھیلائی گئیں جو آج تک دشمنان قرآن کے لئے نمونہ اور سہارا چلی آتی ہیں {۶}۔

قرآن کریم میں طعن و تشکیک کی ان ساری کوششوں اور روایتوں کی اشاعت کے باوجود کسی فرقے یا گروہ کو اپنی دل خوش کن روایات اور مزعومات کے علی الرغم اپنا الگ

نسخہ قرآن (مصحف) تیار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی' حالانکہ اس وقت عالم اسلام چین سے اندلس (سپین) تک اور کوہ قاف (کاکیشیا) سے بحرہند کے ساحلوں تک پھیل چکا تھا اور بعض خاص علاقوں میں بعض خاص فرقے واضح اکثریت میں تھے' مثلاً عمان (مشرقی عرب) میں ہمیشہ خوارج کا زور رہا ہے اور ایران کے بیشتر علاقوں میں ہمیشہ شیعہ اکثریت رہی ہے۔ اور اس زمانے میں اگر کسی دور افتادہ علاقے میں کوئی الگ اور مختلف نسخہ قرآن تیار کر دیا جاتا تو دور دراز کے اسلامی علاقوں پر ـــــ اس زمانے کے وسائل اطلاعات و مواصلات کے مطابق ـــــ تو شاید خبر بھی نہ ہو سکتی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی فرقے یا گروہ کو اپنے مزعومات (اگر کچھ تھے بھی) کے مطابق اپنا کوئی الگ نسخہ قرآن تیار کرنے کی جرات نہ ہوئی یا خیال تک نہ آیا۔ اور بفحوائے آیت قرآنی "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" یہ بات قرآن کریم کے منجانب اللہ محفوظ ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

اور یہ قرآن کریم کا ایک زندہ اور دائمی معجزہ ہے کہ امت میں اتنے اور ایسے فرقوں کے ہوتے ہوئے جن میں باہمی تکفیر کی حد تک نفرت اور عناد موجود تھا ـــــ اور جن میں سے بعض تو قرآن کریم کی صحت اور حفاظت تک کے بارے میں طعن و تشکیک پر مبنی روایات و حکایات کے علمبردار بھی تھے ـــــ ایسے حالات میں تو بقول "الرافعی" قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ لفظ بھی تحریف و تبدیل سے بچ نہ سکتا' چہ جائیکہ پوری امت اور اس کے (باہم متخاصم اور متنازع) تمام فرقے ـــــ ایک ہی خدا اور ایک ہی آخری رسول (ﷺ) کی طرح ـــــ ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ایک ہی قرآن پر متفق اور متحد چلے آتے ہیں {۷} ـــــ اور اس حقیقت کا قائل بعض غیر مسلم مستشرقین کو بھی ہونا پڑا ہے {۸}۔

قرآنی نص (text) کی اس لاجواب اور بے مثال توثیق و توحید (صحت اور وحدت) کا سبب وہ بے خطا (fool proof) اور خودکاری کی حد تک (automatic) جامع اور مربوط نظام حفاظت ہے جس کی بنیاد تین بیک وقت (simaltaneous) جاری اور نافذ العمل اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یعنی (۱) حفظ (یاد کر لینا) (۲) کتابت (لکھ لینا) اور

(۳) اس محفوظ و مکتوب کی مسلسل تلاوت (پڑھتے رہنا)[۹] ـــــ اور کسی بھی عبارت یا کتاب کی صحت و حفاظت کی اس سے بڑی ضمانت اور گارنٹی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے یاد بھی کر لیا جائے' لکھ بھی لیا جائے اور اس کا مسلسل پڑھنا بھی جاری رہے۔ اور صرف قرآن کریم ہی کے بارے میں یہ سہ گانہ نظام حفاظت موجود ہے۔

قرآن کریم دنیا بھر کی واحد دینی کتاب ہے جو بتمامہ مکمل یعنی پوری کی پوری کتاب حفظ اور زبانی یاد کر لینے کا قریباً پیشہ ورانہ نظام (guild) کی طرح کا وسیع رواج بطور ایک مستقل ادارہ (institution) کے قائم چلا آتا ہے ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ متن قرآن کی صحت کے بارے میں محض تحریر اور کتابت پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاتا' بلکہ اصل اعتماد ہمیشہ حفظ اور استظہار قلب (memorization) پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مکتوبہ (یا مطبوعہ) نسخہ قرآن کی صحت کی پڑتال ہمیشہ حفاظ سے ہی کرائی جاتی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ حفاظت قرآن کا ـــــ حفظ' کتابت اور تلاوت پر مشتمل ـــــ یہ سہ گانہ نظام عہد نبوت سے ـــــ بلکہ ابتدائے نبوت اور آغاز وحی سے ـــــ شروع ہوا۔ ہر نئی وحی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے خود حفظ کر لیتے تھے ـــــ اس کے بعد اسے آگے لکھانے' پڑھانے اور حفظ کرانے کا کام چلتا تھا۔ جو صحابہؓ آنحضرت ﷺ سے براہ راست بذریعہ تلقی و سماع (سن کر سیکھ لینا) قرآنی وحی کو یاد کر لیتے یا لکھ لیتے تھے وہ پھر آگے اسے اپنے حلقے (احباب یا اہل و عیال) میں اسی طرح آگے پھیلاتے۔ بعض دفعہ آنحضرت (ﷺ) خاص صحابہ کو اس کام پر مامور فرما دیتے تھے' جس کی ایک مثال حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) کو قبل از ہجرت تعلیم قرآن کے لئے مدینہ بھیجنا ہے۔ بعد از ہجرت مدینہ میں نووارد مسلمانوں کو (بذریعہ کتابت و حفظ) قرآن سیکھنے کے لئے حفاظ صحابہ کے ذمے لگا دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ آنحضرت (ﷺ) صحابہ سے حفظ کردہ قرآن خود بھی سنتے تھے۔ بعض صحابہؓ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ نے' آنحضرت (ﷺ) کے سامنے کئی دفعہ قرآن پڑھا[۱۰] اور جب آخر پر عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں پر اسلام پھیلا تو سب سے پہلے وہاں معلم قرآن صحابہ بھیجے جانے لگے۔

اور اس کے ساتھ ہی سب مسلمانوں کو نمازوں کے اندر اور نمازوں سے باہر بھی قرآن کی بقدر استطاعت باقاعدہ اور روزانہ تلاوت کا حکم تھا۔ پھر عام روزانہ ـــــ اور رات دن گھر اور مسجد میں ـــــ بکثرت تلاوت کے علاوہ (جس کا عالم یہ تھا کہ مسجد نبوی کے علاوہ مسلمانوں کے گھروں میں سے تلاوت قرآن کی گونج اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند ارتعاش کی آواز سنائی دیتی تھی) یہ بھی ثابت ہے کہ بعض صحابہ ایک دن میں ـــــ اس وقت تک نازل شدہ ـــــ پورا قرآن ختم کر لیتے تھے۔ جس کی بناء پر آنحضرت (ﷺ) کو یہ حکم دینا پڑا کہ کوئی فرد واحد تین یا پانچ دن سے کم میں ختم قرآن مکمل نہ کرے۔

اس کے علاوہ رمضان المبارک میں پورے قرآن کا اعادہ اور حفظ قرآن کی صحت کی پڑتال اور چیکنگ کا عمل بھی عہد نبوی سے ہی شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر رمضان میں ـــــ اس وقت تک کے نازل شدہ ـــــ تمام قرآن کا جبریلؑ کے ساتھ عرضہ (دورہ) اور زندگی کے آخری رمضان میں دو دفعہ دورہ کیا' (جسے عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے ـــــ اور جس میں مشہور صحابی زید بن ثابتؓ ـــــ جو خود بھی حافظ قرآن تھے ـــــ آپ کے ساتھ شامل تھے)۔ یہ سب باتیں تواتر سے ثابت ہیں۔

اس آخری عرضہ سے قریباً پانچ ماہ بعد آپؐ کی وفات ہوئی اور اس عرصے میں قرآن کا بہت کم حصہ نازل ہوا ـــــ اور اس مدت میں آپ ـــــ بلکہ زید بن ثابتؓ بھی اسی آخری عرضہ کے مطابق ہی قرآن کی تلاوت کرتے رہے۔ اور یقیناً بہت سے دیگر حفاظ صحابہ نے بھی اپنا علم قرآن تازہ (up-to-date) کر لیا ہو گا ـــــ اور اسی بناء پر آگے چل کر عہد صدیقی میں جمع و تدوین قرآن کا کام اور پھر عہد عثمانی میں مصاحف عثمانی کی تیاری کا کام زید بن ثابتؓ سے ہی کرایا گیا۔ اور صحیح قراءات کی تعیین میں بھی عرضہ اخیرہ کی قراءت کو ترجیح دی گئی' جیسا کہ آگے ذکر ہو گا۔

اور پھر عہد نبوت سے لے کر آج تک دنیا بھر کے اسلامی ممالک اور معاشروں میں حفاظت متن قرآن کا یہی (روزانہ اور) سالانہ عمل پورے ذوق و شوق سے جاری چلا آتا ہے ـــــ بلکہ چونکہ مسلمانوں کے لئے قرآن کی کتابت اور تلاوت کی طرح حفظ قرآن

بھی فرض کفایہ ہے (یعنی اگر کسی بستی یا علاقے میں کوئی آدمی بھی قرآن حفظ نہیں کرتا تو سب گنہگار ہوں گے) ـــــ اور اس (حفظ قرآن) کا مقصد تواتر روایت کا تسلسل اور تحریف و تبدیل سے حفاظت ہے ـــــ اس لئے نزول قرآن کی ابتداء سے لے کر آج تک غالباً کوئی وقت ـــــ دن یا رات ـــــ کم از کم عالم اسلام میں ایسا نہیں گزرا جس میں قرآن کریم کی کتابت' حفظ اور تلاوت کا کام جاری نہ رہا ہو۔

دنیا کی کسی مذہبی کتاب کی اس طرح باقاعدہ سالانہ مکمل دوہرائی (اعادہ) ـــــ بذریعہ حفظ تو کجا بذریعہ تلاوت و قراءت بھی ـــــ نہیں کی جاتی' جب کہ قرآن کریم کی خاطر سال کا پورا ایک مہینہ (رمضان) اس کام (مکمل اعادہ بذریعہ حفظ) کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

حفاظت قرآن کے اس نظام کی بدولت کتابت مصاحف میں کسی تحریف یا دانستہ تبدیلی کے عدم امکان کے باوجود[۱۱] نادانستہ اور سہواً کسی املائی غلطی کے بشری امکان کو تو رد نہیں کیا جا سکتا' لیکن کتابت مصاحف میں اس قسم کی کوئی اتفاقیہ غلطی بھی کبھی زیادہ عرصہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی ـــــ اور اسی لئے مسلم معاشروں میں یہ بات ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ "کوئی نسخہ قرآن (مصحف) اغلاط سے یکسر مبرا اور خالی نہیں ہوتا مگر قرآن کبھی غلط نہیں پڑھا جاتا" ـــــ اور پھر یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کی روزانہ تلاوت لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے ناظرہ خواں مسلمان بھی کرتے ہیں جو خود اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ـــــ اور خود حفاظ قرآن میں سے بھی خاصی بڑی تعداد اس قسم کے "ناخواندہ" بلکہ بسا اوقات "نابینا" لوگوں کی ہوتی ہے جن کی زبانوں پر قرآن صحت قراءت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

اور خود قرآن کریم کی اس ناظرہ خوانی (Visual lection) کی تدریس اور تعلیم کی نگرانی کا کام بھی زیادہ تر حفاظ قرآن ہی کرتے ہیں۔ اور اس عمل کے ذریعے زیر تلاوت مصاحف کی تصحیح کتابت کا کام بھی خود بخود جاری رہتا ہے ـــــ جب کہ حفظ قرآن میں حفاظ کی ممکنہ غلطیوں کی تصحیح کا کام ہر سال دوران رمضان (قرآن سننے سنانے

سے) تکمیل پذیر ہوتا رہتا ہے۔

اور یوں حفظ' کتابت اور تلاوت کے اس مسلسل اور متواتر عمل کی بدولت قرآن کریم کو ابتداء سے لے کر آج تک بلکہ تاقیامت ابدی حفاظت کی ایسی ضمانت اور گارنٹی حاصل ہو گئی ہے جس کے سامنے کمپیوٹر بھی ہیچ ہے۔ آج اگر بفرض محال کسی آفت کی وجہ سے دنیا بھر کے ہر ایک مذہب کی بنیادی دینی کتاب کے تمام کے تمام نسخے تلف اور نیست و نابود ہو جائیں یا کر دیئے جائیں ـــــ تو قرآن اور صرف قرآن ہی کے بارے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ صرف ایک نہیں بلکہ ـــــ مراکش سے انڈونیشیا تک ـــــ متعدد اور مختلف ملکوں میں بے شمار ایسے لوگ (حفاظ) مل کر دنوں یا ہفتوں کے اندر ہر طرح سے مکمل مصاحف (قرآنی نسخے) تیار کر لیں گے' بلکہ ایسے نسخے رسم و ضبط کی صحت کے ساتھ غالباً ایسے تمام مستند اختلافات قراءات کے بھی (جن کا ذکر ابھی ہو گا) آئینہ دار ہوں گے' کیونکہ جس اسلامی ملک میں جو خاص قراءت متداول ہے اس کے حفاظ بھی بکثرت موجود ہیں۔

اور یہاں اس ـــــ بظاہر تعجب انگیز ـــــ حقیقت کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حفاظت متن قرآن ـــــ بذریعہ حفظ و کتابت و تلاوت ـــــ کے اس حیرت انگیز حد تک مربوط نظام میں قراءات کے بعض اختلافات اور تنوعات بھی عہد نبوی سے قائم اور شامل چلے آتے ہیں' جن کی اصل تو بتواتر ثابت حدیث "احرف سبعة" ہے (جس پر مفصل بحث علم القراءات کا موضوع ہے) اور بلحاظ نوعیت ان اختلافات قراءات میں سے بعض کا تعلق کلمات کی بناء و اشتقاق کے (صرفی و نحوی) تغیرات سے بھی ہوتا ہے اور زیادہ تر کا تعلق نطق و تلفظ کی خصوصیات' لہجاتی امتیاز اور طریق ادا سے ہوتا ہے۔

یہ ثابت ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بہت سے کلمات کو ایک سے زائد صورت میں پڑھا ہے [۱۲] جس سے صوتی (لہجاتی) اور معنوی تنوع پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں آپ نے احرفِ سبعہ والے اصول کے تحت ہی سہولت کی غرض سے مختلف قبائل کو اپنے اپنے لہجات (dialects) کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت دی۔ اور اسی نبوی تعلیم اور نبوی اجازت کے باعث عہد نبوی ﷺ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم

کے انفرادی طور پر تیار کردہ مصاحف میں اس قسم کے اختلافات قراءات موجود تھے جو آگے ان صحابہ کے تلامذہ میں منتقل ہوئے۔

پھر جب اسلامی فتوحات کی وسعت کے ساتھ اصل تعلیم کردہ متنوع قراءات کے ساتھ' اجازت یافتہ تنوعات اور بعض دیگر اسباب (مثلاً نو مسلم عناصر کی جہالت یا فساد نیت وغیرہ) کی بناء پر یہی اختلافات قراءات اغلاط اور نزاع کی صورت اختیار کرنے لگے [خیال رہے کہ خود صحابہ ؓ آنحضرت (ﷺ) کی تعلیم کے مطابق اس قسم کے اختلافات پر جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر آج قراءت حفص (جو زیادہ رائج ہے) کے مطابق قرآن پڑھے کسی آدمی کے سامنے کوئی قاری کسی دوسری مستند قراءت مثلاً ورش' قالون یا الدوری (جن کی قراءات مختلف افریقی ممالک میں متداول ہیں) وغیرہ کی قراءات کے مطابق تلاوت کرے تو کوئی اہل علم تو اسے غلط نہیں کہے گا مگر کسی کم علم آدمی کا ردعمل ناگوار ہو سکتا ہے] تو حضرت عثمان ؓ کے زمانے میں ـــــ آنحضرت ﷺ کی وفات سے صرف پندرہ برس کے اندر {۱۳} مشہور صحابی حذیفہ ؓ بن الیمان کی تجویز پر ـــــ اور بقول شیعہ حضرت علی ؓ کے مشورے پر {۱۴} اور صحابہ کے جم غفیر کے اجماع سے ـــــ اور آنحضرت (ﷺ) سے براہ راست یا آپ کی زندگی میں مکمل قرآن حفظ کر لینے والے ماہرین اور اصحاب اختصاص کی ایک کمیٹی کی نگرانی میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ عرضہ اخیرہ میں شامل ہونے والے صحابی حضرت زید بن ثابت (جو عہد نبوی میں کتابت وحی کا کام کرنے کے علاوہ عہد صدیقی میں حفظ و کتابت کی مدد سے ترتیب تلاوت کے مطابق قرآن کریم کی بصورت مصحف جمع و تدوین کے بھی انچارج رہے تھے) کے ہاتھوں ـــــ اور مصحف صدیقی ہی کی روشنی میں ـــــ سات یا آٹھ مصاحف (نسخہ ہائے قرآن) تیار کرا کر تمام اہم مرکزی اسلامی شہروں میں بھجوائے گئے۔ بلکہ ہر ایک مصحف کے مطابق پڑھانے اور شفوی (زبانی) تعلیم دینے کے لئے ایک ایک حافظ قرآن معلم بھی بھیجا گیا ـــــ اور اس وقت سے آج تک دنیا بھر میں متداول مصاحف ان مصاحف عثمانی ہی سے بذریعہ حفظ و کتابت نقل در نقل ہوتے چلے آتے ہیں {۱۵}۔

ان مصاحف عثمانی میں (جن کی تیاری کا قصہ انتہائی اختصار کے ساتھ اوپر مذکور ہوا ہے) قراءات کے تمام مستند بالتواتر اور عرضہ اخیرہ میں ثابت اختلافات اور تنوعات کو شامل کر لیا گیا تھا جس کے لئے بیشتر مختلف فیہ کلمات کو تو ایک مخصوص محتمل القراء تین طریق املاء کے مطابق لکھا گیا۔ اور جن کلمات میں ایسا ممکن نہ تھا ان کو کسی مصحف میں ایک قراءت کے مطابق اور کسی دوسرے مصحف میں دوسری قراءت کے مطابق لکھا گیا۔ اور ان تمام مصاحف میں اختیار کردہ طریق املاء کو رسم عثمانی یا رسم مصحف کہا جاتا ہے۔

اس رسم کی بنیاد صحابہؓ کی اکثریت سے بتواتر ثابت قراءات ہی تھیں۔ یعنی قراءات اصل اور رسم اس کے تابع تھا اور اشتمال قراءات کی بناء پر اس رسم کو نقط و شکل (اعجام و حرکات) سے خالی رکھا گیا تھا--- تاہم اس رسم کا پڑھنا محض لغوی و نحوی امکانات پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ اسے قرآن کریم کی عہد نبوی سے رائج شفوی (زبانی) تعلیم ـــــ بذریعہ تلقی و سماع ـــــ اور صرف سنت سے ثابت قراءات کے تابع کر دیا گیا تھا۔ اور ہر مصحف (نسخہ) کے ساتھ ایک قاری معلم بھی اسی لئے بھیجا گیا تھا۔ اور ان ہی معلم قراء کے ذریعے مختلف شہروں میں مستند اختلافات قراءات میں سے ـــــ کہیں ایک قراءت اور کہیں دوسری قراءت کا رواج ہوا۔ یوں اس رسم کی بدولت اور اس کی تعلیم کو ثابت بالسند قراءات کا پابند کر دینے سے اختلافات قراءات محدود ہو گئے۔

یوں احرف سبعہ کے تحت اجازت یافتہ ـــــ یا بعض صحابہ کے انفرادی طور پر تیار کردہ مصاحف کی بناء پر تعلیم کردہ ـــــ یا دیگر اسباب کے نتیجے میں پیدا شدہ تمام غیر مستند اور غیر معتمد علیہ قراءات کو صحابہ کے اجماعی فیصلے سے 'بطور قرآن لکھنا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ تاہم مصاحف عثمانی کی تیاری سے قبل تک رونما ہونے یا رواج پانے والی یا بعض صحابہ کے انفرادی مصاحف میں وارد مگر بلحاظ اجماع ضعیف اور شاذ قراءات کو بھی بعض دوسرے مقاصد مثلاً تفسیری 'لغوی اور نحوی اغراض کے لئے استعمال کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اور ان اغراض کے لئے امت کے اہل علم ہمیشہ ان قراءات کا ذکر اپنے اپنے فن کی کتابوں میں کرتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے کہ خبرِ واحد ہونے (اور لہٰذا

قرآن سے خارج ہونے) کے باوجود ان میں لغت و ادب اور صرف و نحو کے نقطۂ نظر سے ایک قوت استشہاد موجود ہے۔ بلکہ قراءات (اور اس کے نتیجے میں) کتابت کے ان تمام اختلافات کی بلحاظ سند (اس لئے کہ ان کی بنیاد روایت ہی ہے اور روایت کی قوت یا ضعف اسناد پر منحصر ہوتا ہے) دقت نظر کے ساتھ درجہ بندی (مثلاً متواتر' مشہور' ضعیف اور شاذ بلکہ موضوع تک کی صورت میں) کرلی گئی ہے۔

قوت سند اور تواتر روایت سے ثابت شدہ اختلافات و تنوعات ـــــ جن کو صحابہ کے جم غفیر کے اجماع سے صحیح قرآنی قراءات کا درجہ دیا گیا ـــــ اور جو مصاحف عثمانی میں شامل تھیں ـــــ اور جو اس وقت سے آج تک مصاحف (نسخہ ہائے قرآن) میں لکھی پڑھی جاتی ہیں۔ ایسی تمام قراءات حفظ قرآن کے لحاظ سے نمایاں طور پر نامور صحابہ اور تابعین کے تلامذہ میں سے حجاز' عراق اور شام (جہاں مصاحف عثمانی کے ہمراہ قاری معلمین بھیجے گئے تھے) کے منتخب' معروف اور مستند ترین قراء کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں' جنہوں نے زندگی بھر صرف قراءات کی تعلیم و تعلم کو ہی اپنا اختصاص (specialization) بنایا (اور دیگر علوم مثلاً حدیث و فقہ وغیرہ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے) اور جن کے کثیر التعداد اساتذہ اور تلامذہ کے وسیع سلسلے مشہور و معروف ہیں۔ ایسی تمام قراءات ان نامی قراء کے ناموں کی نسبت سے (جو نسبتِ اختصاص ہے نہ کہ نسبت ایجاد) باہم متمیز اور منتخب و ممتاز قراء کی تعداد کی مناسبت سے بلحاظ عدد القراءات السبع (سات قراءات) کہلاتی ہیں اور ان میں مزید مشہور قراء کے اضافے سے مستند قراءات کی تعداد دس (القراءات العشر) بھی شمار ہوتی ہے اور یہ تمام قراءات حفظ و کتابت قرآن میں مستعمل اور متداول ہیں[۱۶]

اور یہ بات خصوصاً قابل ذکر ہے کہ جس طرح مختلف فرقوں کے باوجود قرآن کریم ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رہا' اسی طرح ـــــ بلکہ اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان سات یا دس قراء کے مستند اختلافات' جو ان قراء کے چوٹی کے تلامذہ سے روایات (کی تدوین بصورت کتب قراءات) کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ ایسے تمام قراءاتی اختلافات و تنوعات بھی امت کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلم اور معتبر ہیں۔ مثلاً شیعہ

بھی (جن کا کردار اسلام میں ہمیشہ نمایاں منفی اپوزیشن گروپ کا رہا ہے) کے نزدیک بھی یہی قراءاور ان کی قراءات مستند ہیں {۱۷}۔

اور امت کے اہل علم جس طرح قرآن کریم کے ان تمام مسلمہ و مستند اختلافات قراءات سے بخوبی واقف ہیں جو عہد نبوی سے ثابت ہیں اور جن کو مصاحف عثمانی کے رسم میں شامل کر لیا گیا تھا اور جو بعد میں سات یا دس مشہور قراء کی نسبت سے مدون کر لی گئیں' اسی طرح اہل علم مسلمان ان تمام بلحاظ سند ضعیف (اور لہٰذا بطور قرآن متروک) اختلافات قراءات کے وجود سے بھی آگاہ ہیں جو مختلف اسباب کی بناء پر مصاحف عثمانی کی تیاری سے پہلے تک رواج پا چکی تھیں' بلکہ جن کا وجود ہی مصاحف عثمانی کی تیاری کا باعث بنا ـــــ اور یوں اس لحاظ سے بھی قرآن کریم دنیا بھر کی واحد دینی کتاب ہے جس کی عبارات میں اگر کسی بھی کلمہ کے تلفظ یا املاء میں کوئی بھی (مستند یا غیر مستند) اختلاف ہوا ہے تو اس کا بھی مکمل ریکارڈ موجود ہے {۱۸} اور اس ریکارڈ کی بلحاظ ثقاہت اور استناد درجہ بندی بھی کر لی گئی ہے۔

کتب قراءات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ سات (یا دس) مسلمہ اور متداول قراءات کے اختلافات (جو بلحاظ نوعیت کلمات کی بناء اور اعراب سے لے کر ان کے نطق اور طریق اداء تک پر مشتمل ہیں) قرآن کریم کے بارہ سو (۱۲۰۰) سے زائد کلمات کے بارے میں واقع ہوئے ہیں {۱۹} جب کہ ان مسلمہ قراءات سے خارج اختلافات (جو آحاد و شواذ پر مشتمل ہیں) قرآن کریم کے دس ہزار سے زائد کلمات (اور مقامات) کے بارے میں بیان ہوئے ہیں {۲۰} اور ان مختلف فیہ کلمات کی اتنی زیادہ تعداد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں سے متعدد کلمات قرآن کریم میں بکثرت تکرار کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ صرف سورۃ الفاتحہ کی مثال لیجئے' اس میں معروف و مستند سات یا دس قراءات کے مطابق کل چار کلمات کے بارے میں اختلاف قراءت ہے' جبکہ متروک القراءۃ اختلافات (آحاد و شواذ) انیس کلمات کے بارے میں مذکور ہیں۔ پھر بعض دفعہ ایک ہی کلمہ کی متعدد (مقبول یا مردود) قراءات آئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ ہی میں سات یا دس مسلّمہ قراءات کے مطابق لفظ "مٰلِكِ" کی دوسری صحیح ثابت بالسنہ قراءت تو "مَلِكِ" ہے' جبکہ خارج

ازبعہ قراءت (آحاد و شواذ) کے مطابق صرف اسی ایک کلمہ (مالک) کی پندرہ مزید صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

اور یہی وہ کثیر الاختلافات قراءات تھیں جو مصاحف عثمانی کی تیاری سے پہلے مصاحف میں بطور قرآن پڑھی جاتی رہیں {۲۱} اور جن میں غلط اور صحیح قراءات خلط ملط ہونے لگی تھیں اور جن پر کم علم عامتہ الناس جھگڑنے لگے تھے۔ مصاحف عثمانی میں سند کی قوت کی بناء پر ثابت تمام صحیح قراءات کو رسم المصحف کے ذریعے (ایک ہی یا متعدد مصاحف میں) شامل کر لیا گیا۔ تاہم چونکہ اس رسم کو پھر بھی (بوجہ عدم نقط و اعجام) غلط بھی پڑھے جانے کا امکان موجود تھا اس لئے اس کا پڑھنا (ساتھ بھیجے گئے) قاری اساتذہ کی شفوی تعلیم کے ذریعے تابع سنت کر دیا گیا۔ جو آگے چل کر بذریعہ ضبط (حرکات) مزید متعین ہو گیا۔ تاہم قرآن کی درست قراءت و تلاوت کی تعلیم کے لئے استاد کی شفوی تعلیم ہمیشہ ناگزیر سمجھی گئی ہے' کیونکہ قراءت و تجوید (خصوصاً طریق نطق و اداء) میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو بذریعہ تحریر و کتابت بیان ہی نہیں کی جا سکتیں' بلکہ ان کی تعلیم و تفہیم صرف استاد کی شفوی تعلیم سے ہی ممکن ہے' مثلاً روم' اشمام و اختلاس' امالہ' تفخیم' ترقیق' تسہیل اور بین بین وغیرہ۔

اس طرح مصاحف عثمانی کے ذریعے صحت قراءت کی بنیاد "رسم کی موافقت" اور "سند کی قوت" کو قرار دیا گیا جس سے ایک تیسری بنیاد "عربیت" (لغوی نحوی درستی) خود بخود حاصل ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ (اور ان کی قائم کردہ کمیٹی) کا مقصد تمام مختلف قراءات (غلط یا صحیح) کو ختم کر کے صرف ایک ہی قراءت (اور طریق نطق و اداء) کو رائج کرنا نہیں تھا اور ایسا کرنا ان کے بس سے باہر اور ناممکن بھی تھا ـــــ اس لئے کہ بعض اختلاف قراءات تو عہد نبوی بلکہ تعلیم نبوی سے ثابت تھے۔ حضرت عثمانؓ کا اصل کام امت کو قرآن کریم کے لئے ایک ہی طریق املاء (رسم) پر جمع کرنا تھا ـــــ اور اسی لئے یہ مجمع علیہ رسم آج تک (رسم عثمانی) بھی کہلاتا ہے ـــــ اور یہی رسم تمام مستند اختلافات قراءات کا جامع بھی تھا ـــــ اور اسی لئے آج تک کتابت مصاحف میں اسی طریق املاء (رسم المصحف یا رسم عثمانی) کی بھی ایسی تدقیق اور تحقیق کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے کہ

اس میں کسی نبرہ (دندانہ) تک کی کمی بیشی نہیں کی جاتی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا مستند یا غیر مستند قراءات کے علاوہ بھی ـــــ تفسیر اور لغات و اعراب کی کتابوں میں متعدد مقامات پر کسی قرآنی لفظ یا عبارت کی بحث میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ اگر اس پر (لفظ یا عبارت) کو یوں (یعنی ایک دوسرے طریقے پر) پڑھا جائے تو بھی بلحاظ عربیت بالکل درست ہو گا (اور معنی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا) ـــــ مگر ایسا کیا نہیں جاتا اور نہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قراءات کی بنیاد تو روایت سنت اور قوت سند پر ہے (نہ کہ لغوی نحوی امکانات پر) ـــــ حتیٰ کہ اگر کوئی لفظ خود قرآن کریم میں (بلحاظ قراءت و کتابت) دو طرح آیا ہے تو بھی جہاں جس طرح آیا ہے وہاں اسی طرح لکھا اور پڑھا جائے گا ـــــ مثلاً "یَنَذَ کَّرُوْنَ" کو "یَذَّ کَّرُوْنَ" اور "تَتَنَزَّلُ" کو "تَنَزَّلُ" بھی پڑھ سکتے ہیں اور قرآن کریم میں ان افعال کی دونوں صورتیں مختلف جگہ وارد ہوئیں ہیں' مگر جہاں جو لفظ جس طرح آیا ہے وہاں اسی طرح لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی عبارت پر ایک معنی و مفہوم والے متبادل کلمات کا بیک وقت استعمال (تعداد قراءات) بذات خود کوئی خرابی نہیں بلکہ خوبی ہے اور یہ زبان کی قوت اتساع اور صاحب کلام کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے اور اسی لئے یہ چیز اعلیٰ ادبی نصوص کی ایک خصوصیت شمار ہوتی ہے ـــــ اور قرآن کریم کی حد تک تو یہی چیز (جسے ہم اختلاف قراءت کہتے ہیں) بلاغت کی انتہاء' ایجاز (قلت الفاظ مع کثرت معانی) کا جمال اور اعجاز کا کمال ہے کہ اتنے اختلافات و تنوعات کے باوجود کہیں معانی میں تضاد یا تناقض نہیں۔ بلکہ اس (اختلاف قراءات) کے بعض مزید لغوی اور شرعی منافع اور فوائد بھی ہیں جن کو کتب قراءات میں بیان کیا گیا ہے[۲۲]۔

رسم عثمانی کے اندر محدود اور بلحاظ روایت مستند قراءاتی اختلافات (جو سات یا دس مشہور قراءات پر مشتمل اور ان کی اصل ہیں) ہمیشہ سے اہل علم (قراء) کے مطالعہ و دراسات اور ان کے عملی اطلاقات اور شفوی (زبانی) تعلیمات کا موضوع رہے ہیں۔ بلکہ مختلف عوامل کی بنا پر بعض علاقوں میں بعض خاص قراء کی روایات قراءات زیادہ مقبول

اور رائج ہوئیں اور وہاں کے مصاحف بلحاظ رسم و ضبط اسی خاص (متداول) قراءت کی روایت کے مطابق لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً تمام ایشیائی ممالک (اور افریقہ میں سے مصر میں روایت حفص (عن عاصم الکوفی) عام ہوئی۔ مغربی اور شمالی افریقہ میں ورش اور قالون (عن نافع المدنی) کی روایتوں کو پذیرائی ملی۔ سوڈان اور بعض دیگر علاقوں میں الدوری (عن ابی عمرو البصری) کی روایت کو فروغ حاصل ہوا ـــــ اور قلمی دور کے بعد آج کے دور طباعت میں بھی ان خطوں کے مصاحف وہاں کی رائج و متداول روایت قراءت کے مطابق ہیں۔

بلکہ قراءت و کتابت کلمات میں بھی ان مستند اختلافات و تنوعات کے علاوہ بعض دوسرے توقیفی (آنحضرت ﷺ کے بتائے ہوئے) امور مثلاً اسماءِ سُوَر اور تعدادِ آیات میں بھی اختلاف موجود ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی سولہ کے قریب سورتوں کے ناموں میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح سورتوں کی آیات کی گنتی میں بھی بوجہ روایت اختلاف ہے ـــــ اور یہ تمام مختلف النوع مگر مستند اور معتد علیہ اختلافات اہل علم میں معروف ہیں۔ چنانچہ اگر کسی ایک مصحف (نسخہ قرآن) میں مثلاً ایک سورت کا نام "المومن" لکھا ہو اور کسی دوسرے علاقے کے مصحف میں اسی سورت کا نام "غافر" درج ہو یا دو مصاحف میں بعض سورتوں کی آیات کی گنتی میں فرق ہو' مثلاً کسی مصحف میں سورۃ البقرہ کی ایک آیت کا نمبر ۲۱۹ ہو جبکہ کسی دوسرے مصحف میں اسی آیت کا نمبر ۲۱۷ دیا گیا ہو ـــــ بلکہ اگر کسی ایک مصحف میں سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۳۵ (بلحاظ کوفی گنتی) میں کلمہ "منھا" (واحد مونث غائب ضمیر کے ساتھ) لکھا ہے جبکہ کسی دوسرے (علاقے کے) مصحف میں اسی آیت کا یہی لفظ بصورت "منھما" (تثنیہ غائب کی ضمیر کے ساتھ) لکھا ہو ـــــ یا مثلاً کسی ایک مصحف میں سورۃ الزخرف کی (بلحاظ کوفی گنتی) آیت نمبر ۴۱ میں لفظ "تشتھیہ" لکھا ہو جبکہ کسی (دوسری قراءت والے) مصحف میں اسی آیت کا یہی لفظ "تشتھی" (آخری ضمیر منصوب کے حذف کے ساتھ) لکھا ملے' تو کسی بھی اہل علم مسلمان کے لئے ایسے مسلمہ' معتبر اور متداول اختلافات کسی شک و شبہ تو کجا تعجب کا باعث بھی نہیں بن سکتے۔ البتہ کم علم مسلمانوں کو ایسے مواقع پر شاید کتابت کی غلطی کا

احساس ہو' یا پھر غیر مسلموں کے نام نہاد سکالرز ("اہلِ علم") کو ان اختلافات میں بھی فتنۂ تشکیک کے لئے کوئی کرن نظر آئے۔

اسی طرح جب کوئی اہل علم مسلمان تفسیر' ادب' لغت یا نحو کی کسی کتاب میں کسی کلمہ کے "یکے از قراءات" مذکور ہونا پڑھتا ہے جب کہ اس قراءت کا کسی بھی مصحف کے متن میں کہیں وجود نہیں ملتا تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تمام اہل علم مسلمان اس قسم کی غیر مستند (اور شاذ) قراءات کے وجود سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں حفظ و تحفیظ قرآن کے متعلق اور پھر اختلافات قراءات کی حقیقت اور کیفیت کے بارے میں قدرے مفصل بات (تمہیداً) اس لئے کی ہے کہ آگے چل کر ہم صلیبیوں اور صیہونیوں (مسیحیوں اور یہودیوں) کی قرآن دشمنی کے جن پہلوؤں کا ذکر کریں گے ان کا ان دو موضوعات سے گہرا تعلق ہے۔ یہ لوگ قرآن میں طعن و تشکیک کے بارے میں جو کچھ گرد و غبار اڑاتے ہیں اس میں حفاظت قرآن بذریعہ حفظ و استظہارِ قلب کا ذکر ہی گول کر جاتے ہیں اور کتابت قرآن کے احوال تک محدود رہتے ہیں اور اس میں بھی عموماً اپنی دینی کتابوں (اناجیل یا بائبل) کی (ابتدائی) صدیوں بعد ہونے والی تدوین و تکمیل پر ہی قیاس کرنے کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اس کا سبب نیت کی خرابی' ہٹ دھرمی اور اندھا تعصب بھی ہو سکتا ہے۔ اور شاید اس میں اس حقیقت کا بھی دخل ہے کہ وہ لوگ دینی کتابوں کے بارے میں حفاظت متن کے لئے کتابت کے ساتھ ساتھ حفظ و تلاوت متن کے متواتر اور مسلسل عوامی عمل کی افادیت تو درکنار اس کے تصور سے بھی ناآشنا ہیں ـــــ جس کا ذاتی تجربہ راقم السطور کو پنجاب یونیورسٹی کے ایک انگریز مسیحی پروفیسر کے ساتھ بعض قرآنی آیات کے مطلوبہ تمام حوالے بغیر انڈیکس محض حافظہ کی مدد سے زبانی بتانے پر ہوا ـــــ اور اسی جہالت کی بنا پر ان لوگوں نے محرف مصاحف (نسخہ ہائے قرآن) تک شائع کر ڈالے' جس کا ابھی آگے ذکر آئے گا۔

[خیال رہے قرآن کریم تک تو براہ راست رسائی ابتداء ہی سے ہر مسلمان کے لئے صرف ممکن ہی نہیں بلکہ فرض عین تھی۔ جبکہ یہود و نصاریٰ میں بائبل یا اناجیل کا پڑھنا پڑھانا ایک اقل قلیل گروہ تک محدود تھا۔ اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ صلیبی اور صیہونی

قرآن پر بات کرتے وقت اپنے اس تاریک اور محدود ذہنی خول سے باہر نہیں نکل سکتے]۔

اسی طرح یہ لوگ ہماری ہی کتابوں سے ڈھونڈ کر غیر مستند قراءات کو ہمارے نام نہاد مغرب کے تعلیم یافتہ مگر اپنے علوم اور ثقافت سے نابلد لوگوں کے سامنے یوں پیش کرتے ہیں گویا کوئی نیا علمی انکشاف کر رہے ہیں جو مسلمانوں سے پوشیدہ چلا آتا ہے یا شاید انہوں نے اسے عمداً چھپا رکھا ہے۔ جیساکہ آرتھر جیفری نے کیا ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

{۱} "Islam our choice" کی قسم کی کتابوں میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ ریاض سے نکلنے والے ماہنامہ "الفیصل" کے ہر ایک شمارے میں "الطریق الی اللہ" کے عنوان سے کسی ایک ایسے نومسلم --- مرد یا عورت --- کا واقعہ مذکور ہوتا ہے۔

{۲} سب سے پہلے جن اہل علم نے قرآن کے خلاف مختلف مطاعن اور شکوک و شبہات کے رد میں قلم اٹھایا ان میں نمایاں نام ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم) الدینوری (ت ۲۷۶ھ) کا ہے۔ دیکھئے ان کی کتاب "تاویل مشکل القرآن" ص ۲۵-۶۵

{۳} دیکھئے الرافعی' اعجاز القرآن' ص ۱۶۱ تا ۱۶۸ اور مالک بن نبی الظاھرۃ القرآنیۃ' ص ۴۰

{۴} اس کے بعض نمونوں کا ذکر دکتور لبیب السعید نے اپنی کتاب "الجمع الصوتی الاول للقرآن" میں کیا ہے' دیکھئے کتاب مذکور' ص ۳۴۹ تا ۳۵۶

{۵} مثلاً دیکھئے الطبرسی تفسیر' مجمع البیان' ج ۱ ص ۳۰۔ عبداللہ دراز۔ المدخل الی القرآن' ص ۳۹-۴۰۔ لبیب السعید الجمع الصوتی الاول' ص ۳۵۴-۳۵۷

{۶} اس قسم کے مطاعن کی تفصیل اور ان کے رد کے لئے دیکھئے دکتور لبیب السعید کی "الجمع الصوتی الاول" ص ۳۲۵ تا ۳۵۷

{۷} دیکھئے الرافعی' اعجاز القرآن' ص ۴۲

{۸} دیکھئے عبداللہ دراز "المدخل الی القرآن" ص ۳۹-۴۰ اور معجم القراءات القرآنیۃ (احمد مختار و عبدالعال) ج ۱' ص ۴-۵

{۹} یاد رہے کہ قراءت (reading) خاموش بھی ہو سکتی ہے۔ مگر تلاوت (recitation) کا مطلب ہی اتنی اونچی آواز سے پڑھنا ہے جسے کم از کم پاس بیٹھا آدمی سن سکتا ہو اور یہ چیز تلفظ اور قراءت کی درستی کا کام بھی دے سکتی ہے۔

{۱۰} دیکھئے الزنجانی "تاریخ القرآن" ص ۳۵-۴۸' الطبرسی "معجم البیان" ج۱' ص ۳۱

{۱۱} اگرچہ بعض اعدائے اسلام نے ہمارے زمانے میں اس خباثت یا حماقت کی کوشش کی ہے جیسا کہ اس کا بھی آگے اسرائیلی صیہونی سازشوں کے بیان میں محرف نسخہ قرآن کی اشاعت کا ذکر آئے گا۔

{۱۲} جس کی ایک واضح مثال نمازوں میں روزانہ پڑھی جانے والی سورۃ -- الفاتحہ -- میں "مالک" اور "ملک" کی قراءت ہے۔

{۱۳} جیسا کہ ابن حجر نے تصریح کی ہے' دیکھئے' معجم القراءت' ج۱' ص۶۱ بحوالہ فتح الباری

{۱۴} دیکھئے الزنجانی' تاریخ القرآن' ص ۶۵-۶۸

{۱۵} معروف فرانسیسی مستشرق لوبلوا (leblois) نے اپنی کتاب "قرآن اور عبرانی تورات" (le Koran la Bible Hebriaque) میں مسلمانوں کے عہد ابی بکرؓ اور پھر عہد عثمانؓ میں وفات نبوی کے بعد بہت جلد قرآن جمع کر لینے کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کونسا مسیحی یہ تمنا نہ کرے گا کہ کاش مسیحؑ کے (معاصر) تلامذہ بھی مسیحؑ کے فوراً بعد (اسی طرح) اس کی تعلیمات کو جمع اور مدون کرنے کا کام کر جاتے (دیکھئے عبداللہ دراز "المدخل الی القرآن" ص۲۶)

{۱۶} ان مشہور قراء کے نام مع نسبت و سن وفات یوں ہیں (۱) ابن عامر شامی ۱۱۸ھ' (۲) ابن کثیر مکی ۱۲۰ھ' (۳) عاصم کوفی ۱۲۸ھ' (۴) نافع مدنی ۱۶۹ھ' (۵) ابو عمرو بصری ۱۵۴ھ' (۶) حمزہ کوفی ۱۵۶ھ' (۷) الکسائی کوفی ۱۸۹ھ' (۸) ابو جعفر مدنی ۱۳۰ھ' (۹) یعقوب الحضرمی ۲۰۵ھ' اور (۱۰) خلف کوفی ۲۲۹ھ....

{۱۷} مثلاً دیکھئے الطبرسی' مجمع البیان' ج۱' ص ۲۳-۲۵' الزنجانی' تاریخ القرآن' ص ۸۰-۸۶ اور الخوئی "البیان" ص ۱۴۰-۱۶۰

{۱۸} دیکھئے الطبرسی' مجمع البیان' ج۱ ص ۳۰-۳۱ بحوالہ السید الشریف المرتضی

{۱۹} جن آیات میں یہ اختلافات واقع ہوئے ہیں ان کی اجمالی فہرست کے لئے دیکھئے ابن مجاہد کی "کتاب السبعہ" ص ۷۰۵ تا ۷۷۸ اور ابن مہران کی "الغایہ فی القراءات العشر" ص ۳۰۵-۳۴۷

{۲۰} دیکھئے' معجم القراءات القرآنیہ' آٹھویں جلد کے آخر پر

{۲۱} الابانہ للمکی' ص ۸۰

{۲۲} مثلاً دیکھئے "معجم القراءات القرآنیہ" ص ۱۲۳-۱۲۴' تقریب النشر لابن الجزری ص ۵۹-۶۱

قرآن کی فکری اور فنّی عظمت

ڈاکٹر تو قیر عالم فلاحی' لیکچرر شعبہ دینیات' مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ

ابتدائے آفرینش سے ہی انبیاء کرام جیسی برگزیدہ اور مقدس ہستیاں بنی آدم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مبعوث کی جاتی رہی ہیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر انبیائے کرام کو صحیفے اور کتابیں بھی دی گئیں۔ انبیائی بعثت کے اس مقدس سلسلے کی آخری کڑی محسن انسانیت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ ﷺ کو حضرت جبرئیل امینؑ کے ذریعہ وحی کی شکل میں قرآن مقدس سے نوازا گیا۔

اسلام ایک کامل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ قرآن مجید اس ضابطہ الٰہی کی ایک مستند تحریری کتاب اور سیرت پاک اس ضابطہ حیات کی عملی تفسیر ہے۔ قرآن کسی بھی شعبہ زندگی کو تشنہ نہیں چھوڑتا' خواہ وہ شعبہ سیاسی ہو یا معاشی' انفرادی ہو یا اجتماعی' عائلی ہو یا ازدواجی' مادی ہو یا روحانی اور عدالتی ہو یا پارلیمانی' غرض یہ کتاب ہر معاملہ زندگی اور ہر گوشہ عالم میں راہبر و راہنما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایمان و ایقان کی نعمت عظمیٰ سے شرف یاب ہونے والوں کو تلقین کرتا ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً..... ﴾

(البقرہ : ۲۰۸)

"اے ایمان لانے والو! اسلام میں پوری طرح سے داخل ہو جاؤ"۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مخصوص خطہ ارض یا قوم کے لئے نہیں بلکہ جغرافیائی حدود و قیود سے بالا ہو کر پوری دنیائے انسانیت کے لئے تشریف لائے' اس لئے قرآن پاک کچھ طبقوں اور فرقوں کے لئے ہی نہیں اور نہ ہی مخصوص خطوں اور گوشوں کے لئے ہے بلکہ پوری انسانیت اور زندگی کے ہر شعبے کے لئے ضابطہ اور دستور الٰہی کی حیثیت سے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ قرآن پاک کی اہمیت و حیثیت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ یہ خاتم

النبیین ﷺ پر نازل ہوا۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' اس لئے انسانیت کی ہدایت کا جو ضابطہ آپؐ کو دیا گیا وہ وقتی نہیں ہے بلکہ مستقل اور قیامت تک کے لئے ہے۔ قرآن پاک الہامی کتاب ہے' اس پر تو تمام مسلمانان عالم کا ایک ایمان و ایقان ہے ہی' لیکن اس کتاب کے اندر ایسی نمایاں ترین خصوصیات موجود ہیں جن کی روشنی میں اغیار بھی اعتراف حقیقت سے گریزاں نہیں ہو سکتے' بشرطیکہ وہ جانبداری اور تعصب کے حصار سے نکل کر دیانتداری کا ثبوت دیں۔ ذیل میں قرآن پاک کے فکری اور فنی پہلوؤں پر قدرے مبسوط جائزے سے قبل اس کے چند امتیازات مرقوم کئے جاتے ہیں :

امتیازی خصوصیات

۱) اس کتاب زندہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا کا ہر مصنف یا محقق جو اپنی شاہکار تخلیق پیش کرتا ہے وہ چاہے جتنا بڑا عالم ہو' وہ اس بات کے اظہار کی جرات نہیں کرتا کہ اس کی پیش کردہ کتاب کی ہر ہر بات اور اس کی ہر ہر شق حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اگر ہمہ دانی کے زعم میں اور خود توقیری کے جذبے سے معمور ہو کر وہ یہ بات کہتا بھی ہے تو مرورِ زمانہ اس کے دعویٰ کو بے حقیقت اور باطل ثابت کر دیتا ہے۔ آج بڑے سے بڑا نظریہ جس پر دنیا مخصوص مدت میں ہی سہی' ایمان لے آتی ہے وہی نظریہ بعد کے آنے والے ماہرین کے ذریعہ رد کر دیا جاتا ہے' لیکن یہ قرآن پاک کا ہی امتیاز ہے کہ اس کے خالق نے اس کی تمام تر صداقت و سچائی کا اعلان بھی مقدمہ کتاب کے اندر ہی کر دیا۔ فرمایا "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ" (البقرہ : ۲) یعنی یہ ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں شبہ نہیں۔ یہ کوئی دعویٰ محض نہیں تھا بلکہ چودہ صدیوں پیشتر کی پوری تاریخ اس کی صداقت پر روشن دلیل ہے کہ آج تک یہ کلام اصلاح و ترمیم کے مرحلے سے نہیں گزرا اور نہ ہی تغیر و تبدل کا شکار ہوا۔

۲) دوسری چیز جو اس کتاب ہدایت کے الٰہی کلام ہونے پر شہادت فراہم کرتی ہے' وہ یہ کہ کوئی انسان جب اپنی کتاب تصنیف کرتا ہے تو وہ مقدمہ کتاب میں عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی کم مائیگی علم اور بے سروسامانی کا شکوہ کرتے ہوئے

دوسروں کے لئے ہدیۂ تبریک اور کلماتِ تشکر پیش کرتا ہے اس لئے کہ دوران تالیف و تصنیف وہ دوسرے ذرائع کی مدد حاصل کرتا ہے' علماء و ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے' نیز تجربہ رکھنے والوں اور دقیقہ شناسوں کی راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس کے تذلل و خاکساری کے اظہار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے کلام میں انانیت یا تکبر کا شائبہ ہو تو کم از کم حساس اور باضمیر لوگوں کی جانب سے یہ کتاب خراج تحسین حاصل نہیں کر پاتی اور مؤلف یا مصنف قدر و احترام کی نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن پاک کے اندر خواہ مقدمہ کتاب ہو یا کوئی اور حصہ' کہیں بھی عاجزی کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ ہی دوسروں کے لئے تشکر و امتنان کے کلمات کہے جاتے ہیں بلکہ جگہ جگہ یہ تذکیر کرائی جاتی ہے کہ یہ کلام غالب' مقتدر اور علیم و خبیر ہستی کی طرف سے ہے بلکہ اس اعلان حقیقت سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اس میں بڑا وزن آجاتا ہے۔ رہی بات خراج عقیدت حاصل کرنے کی تو اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی قرآن مقدس کے سامنے عقیدت و احترام کے سر جھکا دیئے ہیں۔

۳) تیسری اور بڑی اہم چیز جو قرآن پاک کے خدائی کتاب یا آسمانی کلام ہونے کے موقف کی تائید کرتی ہے وہ اس کا بعینہٖ محفوظ و مامون ہونا ہے۔ دنیا کا کوئی مصنف یا مترجم اپنی کسی تالیف یا تصنیف کے بارے میں اس کی حفاظت کا ضامن نہیں ہوتا' زیادہ سے زیادہ اس مفہوم میں وہ اپنی زندگی تک اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں نہ ہی کوئی تبدیلی کرے گا اور نہ ہی اسے کسی قسم کے تغیر کا نشانہ بننے دے گا۔ حالانکہ انسان کی زندگی میں بسا اوقات ناگزیر حد تک تبدیلی و ترمیم کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ وہ ماضی کے حالات کا نہ تو استقصاء کر سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے بارے میں حتمی اور قطعی بات کہہ سکتا ہے اور اگر ایسا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک کتاب جو آج سے کچھ برسوں پیشتر تصنیف و تالیف کا جامہ پہن چکی ہے' اس کے اندر حالات زمانہ کے تغیر کے لحاظ سے تبدیلی و اصلاح کی جائے اور اسی ضرورت کے پیش نظر ایک کتاب کے کئی ایڈیشن نکلتے ہیں' اور شاید ہی کوئی ایڈیشن حذف و اضافہ سے پاک ہوتا ہے۔ بالفرض حالات زمانہ سے بے اعتنائی برت کر اور اپنی عقل پر پردہ ڈال کر کوئی مصنف ایک حرف بھی نہ بدلنے

کا تہیہ کرلے تو اس کی یہ کتاب خامیوں اور نقائص کے ساتھ اس کی زندگی ہی تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس کی موت کے بعد یقینی طور پر وہ کتاب اصلاح و تبدیلی کے مرحلے سے گزرتی ہے یا پھر ضائع ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک کا نازل کرنے والا علیم و خبیر ہے۔ وہ دلوں کے اسرار سے واقف ہے' ماضی' حال اور مستقبل کے تمام تر احوال و کوائف سے باخبر ہے۔ اس لئے قرآن کے مالک کو حالات زمانہ کے تغیر کے لحاظ سے اپنی کتاب کے کئی ایڈیشن منظر عام پر نہیں لانے پڑے اور اپنی اس کتاب میں ہی تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل یہ اعلان فرمادیا تھا :

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۝ ﴾

(الحجر : ۹)

"بلاشبہ ہم نے ہی اس "ذکر" (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

اور سچ یہ ہے کہ اقوام و ملل کے ایک طویل سلسلے کی آمد و رفت ہوئی' حق و باطل کے متعدد معرکے گرم ہوئے' اللہ و رسول کے دشمنوں کی مختلف ٹولیاں سامنے آئیں اور حق کی شعاعوں کو بجھانے اور باطل کو فروغ دینے کے لئے ہر دور میں فرعون و نمرود پیدا ہوتے رہے لیکن اس کتاب الٰہی کا ایک حرف بھی ادھر سے ادھر نہ کرسکے۔ قرآن اپنے آغاز نزول میں جن الفاظ کے ساتھ تھا' انہیں الفاظ میں اب بھی محفوظ و مامون ہے۔ جن اصولوں کی وہ تشہیر و تبلیغ صدیوں پہلے کر رہا تھا وہی اصول آج تک قرآن کے موضوعات ہیں اور جن افکار و نظریات کا علم لے کر اس پر آشوب اور پر فتن دور میں اپنے انوار کی تجلیاں بکھیر رہا تھا اس کی یہی معنویت آج تک برقرار ہے اور تاقیامت رہے گی۔

۴) چوتھی خاص بات جو قرآن کو کتاب الٰہی ثابت کرنے میں اہم مقام رکھتی ہے وہ یہ کہ دنیا کی کوئی کتاب قرآن کے مثل اتنی زیادہ عقیدت کے ساتھ نہ پڑھی جاتی ہے اور نہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ اس کا معاملہ دوسری کتابوں کے بالمقابل بالکل منفرد ہے۔ اربوں کی تعداد میں لوگ دنیا کے مختلف گوشوں میں کم از کم پانچ اوقات پابندی کے ساتھ اسے پڑھنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ اپنے مذہب کے نمائندہ نہیں ہو سکتے۔ اس

لحاظ سے اس کی تلاوت کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ تمام مسلمان بھی جن کا تعلق کسی قدر بھی اسلام سے ہے وہ قرآن کو سمجھنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک ضابطہ زندگی ہے جو پوری انسانیت کے لئے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کرتا ہے اور جو خوش قسمتی سے مسلمانانِ عالم کو امانت کے طور پر نبی عربی محمد ﷺ کے ذریعہ ملا ہے۔ چنانچہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم و تفسیر کا ایک مقدس سلسلہ چل پڑا ہے جس سے عام لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

۵) قرآن کی ان تمام خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے وہ یہ کہ تیئس سال میں نزول کے باوجود قرآن کے کسی حصہ میں تضاد و تناقض نظر نہیں آتا۔ انداز و اسلوب کے پرکشش ہونے میں کمی و بیشی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر قرآن بشری کلام ہوتا تو اس طویل عرصے میں کہیں نہ کہیں اختلاف لفظی و معنوی ضرور پایا جاتا جو تقاضائے بشریت ہے۔ انسان کی عمر اور حالات کے ساتھ اس کے جذبات و خیالات اور تعبیرات و تشریحات میں تغیر و تبدل واقع ہو جاتا ہے جس کی عکاسی کلام و بیان اور تحریر میں لامحالہ نظر آتی ہے۔ لیکن قرآن ابتدائے وحی سے اختتام وحی تک ایک ہی لہجہ و اسلوب' عمیق فکر اور ربط و تسلسل کے ساتھ نازل ہوتا رہا۔ چنانچہ اول سے آخر تک وہی قدسیت و کبریائی اور وہی شان و عظمت یہاں ناطق نظر آتی ہے۔ قرآن کے منکروں کے لئے اس باب میں یہی جواب کافی ہے' جیسے فرمایا :

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ' وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ ﴾ (النساء : ۸۲)

"کیا وہ قرآن کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے' اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو وہ اس میں بہت سارے اختلافات پاتے"۔

قرآن انقلاب کا پیغامبر

آفتاب حق طلوع ہونے سے قبل پوری دنیائے انسانیت میں بالخصوص عرب کا خطہ بڑا ہی قابل رحم تھا۔ حق و باطل' صحیح و غلط' جائز و ناجائز' خیر و شر اور مستحسن و قبیح کے

معاملے میں زاویہ فکر بدلا ہوا تھا۔ معاشرے میں کفر و شرک اور الحاد و بے دینی کی تیز و تند ہوائیں چل رہی تھیں۔ قبائلی اور گروہی تعصب نیز باہمی عداوت کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں۔ انہیں نادیدنی حالات میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ قرآن جو رسالت کی دلیل کی شکل میں آپ کو دیا گیا تھا اس کے ذریعہ معاشرے میں حق و صداقت کی شعاعیں بکھیری جا رہی تھیں۔ یہ کتاب لوگوں کے دل و دماغ کو بدل رہی تھی' سوچنے سمجھنے کے انداز کو مہذب کر رہی تھی اور فاسد افکار و خیالات کی بیخ کنی کرتے ہوئے اقدار صالحہ کے فروغ میں سرگرم عمل تھی۔ اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی پرستش' دوسرے معبودان باطل کی عظمت و تقدیس اور کسی خاص قبیلے یا گروہ کے خدا ہونے کے زعم باطل پر تیشہ چلا دیا نیز انسانیت کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کے آگے سر اطاعت جھکا دینا خود اپنے نفس اور خالق حقیقی پر ظلم ہے اور یہ ایک ایسی شنیع اور رذیل حرکت ہے کہ اس کے ارتکاب کے بعد انسان اشرف المخلوقات کی بلندیوں سے گر کر ارذل المخلوقات کی پستیوں میں چلا جاتا ہے۔

قرآن پاک کے نزول کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) معاشرتی تبدیلی (۲) سیاسی تبدیلی (۳) اخلاقی تبدیلی۔

تعصب اور چشمک کے دلدل میں پھنسے رہنے کی وجہ سے قوم کا تصور ہونے کی بجائے اہل عرب کے یہاں قبیلے کا تصور کار فرما تھا۔ جب ان صحرا نشینوں میں قرآن پاک کتاب ہدایت بن کر نمودار ہوا تو اس نے اپنی تابانیوں سے دوسروں کے دل و دماغ کے دریچوں کو بھی کھول دیا۔ تعصب کی چنگاریاں ٹھنڈی پڑ گئیں' قتل و غارت گری کے لامتناہی سلسلے سے انسانی معاشرے کو نجات ملی' عورت جو سراپا ذلت و تحقیر تھی' عزت و توقیر کا سبب بن گئی نیز وہ اپنے تمام حقوق سے متمتع ہوئی اور مجموعی طور پر انسانیت نے پھر اپنے شرف و عظمت کا لبادہ زیب تن کر لیا۔

دوسری قسم کی تبدیلی سیاسی نوعیت کی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے یہاں قوم کا وسیع تصور نہیں تھا۔ قبائلی اور گروہی تعصبات میں وہ مست تھے۔ قبیلے ہی کے لئے جیتے اور قبیلے ہی کے لئے مرتے تھے۔ حرب داحس و غبراء اور حرب بسوس' یہ دو ایسی تاریخی

جنگیں ہیں جو انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ یہ دونوں جنگیں گروہی تعصب اور منافرت و چپقلش کی شاہکار مثالیں ہیں۔ قرآن نے جب عرب کے بدوؤں میں اپنی روشن شعاعیں بکھیریں تو ان کے فکر و نظر کا زاویہ بدلا' عداوت و منافرت کے جذبات سرد پڑے' امن و سکون کا بول بالا ہوا' بشر دوستی اور انسانیت نوازی کا چلن عام ہوا اور اس طرح ان کے سیاسی معاملات بھی مہذب ہوئے۔

اخلاق و آداب کی تہذیب و تزئین کے ضمن میں بھی قابل ذکر تبدیلی رونما ہوئی۔ اس سلسلے میں اسلام نے جن مبنی بر حکمت تعلیمات سے عالم انسانیت کو مستفیض کیا ان کا عشرِ عشیر بھی دوسرے مذاہب و نظریات میں نظر نہیں آتا۔ حیا و پاکدامنی' غض بصر' عفو و درگزر' عدل و انصاف اور ایفائے عہد و پاسداری امانت کے باب میں قرآن نے ایسی تعلیمات دیں کہ انسان اندر سے بدل گیا۔ شراب نوشی اور جوابازی سے نفرت' چوری و زناکاری سے بعد اور فریب دہی و دغابازی سے احتراز و اجتناب کے ایسے زریں اسباق قرآن پاک نے سکھائے کہ انسانی معاشرہ شر و فساد کا باغی اور خیر و فلاح کا علمبردار اور سچا پیامی بن گیا۔ غرضیکہ ہمہ جہت انقلاب و تبدیلی قرآن حکیم کی ہی مرہون منت ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اس انقلاب کو قرآن و اسلام کی دین قرار دیتے ہوئے کہا گیا :

> *IT REVOLUTIONIZED THE SOCIAL, POLITICAL, INTELLECTUAL AND ECONOMIC LIFE OF ARABS. IT BROUGHT WITH IT A GOSPEL WHICH IN ITS PHILOSOPHY AND SPIRITS SUBSTANTIALLY DIFFERED FROM THE PHILOSOPHY AND SPIRITS OF ARAB LIFE.* [1]

"اس نے عرب کے سماجی' سیاسی' علمی اور معاشی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ یہ اپنے ساتھ ایک ایسی صداقت لے کر آیا جو اپنے فلسفہ و روح میں عربوں کے فلسفہ حیات اور اس کی روح سے بالکل مختلف تھا"۔

قرآن چونکہ مذہب اسلام کا ایک دستور ہے جو قیامت تک پوری دنیا کی ہدایت و فلاح کے لئے ہے۔ لہٰذا اگر اس کے کتاب الٰہی ہونے پر شک کیا جاتا ہے یا قرآنی تعلیمات

کے سلسلے میں قیل و قال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کی اساس اور بنیاد کو کمزور کیا جاتا ہے۔ مشہور مؤرخ "جرجی زیدان" کے بقول :

"اسلام کی اساس قرآن مجید ہے۔ اس کی تائید میں خود اسلام یا عرب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے سلسلے میں یہی اعتقاد صحابہ کرام کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ جب جنگوں میں فتح و تسخیر کے علم گاڑ دیئے گئے تھے اور وہ روم و ایران کی حکومتوں پر غالب ہو گئے تو ان کا اعتقاد اس بات پر اور بھی مضبوط ہو گیا کہ عرب کے علاوہ کوئی دوسرا فریق کبھی غالب نہیں آ سکتا' بشرطیکہ قرآن کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا جائے"۔ {۲}

احمد حسن زیات کے بقول اس کلام کے اندر کسی شک و ریب اور تردد و پس و پیش کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں کذب و بطلان کا کوئی گزر نہیں ہے۔ یہ برتر ہستی کی جانب سے نازل کی ہوئی آیات ہیں۔ یہ آپ کی دعوت کی موید اور آپ کی امت کے لئے ایک ضابطہ اور دستور حیات ہے۔ {۳}

پروفیسر فلپ کے حٹی کا قرآن پاک سے متعلق یہ تبصرہ بجا ہے :

THE RELIGIOUS INFLUENCE IN EXERCISES AS THE BASIS OF ISLAM AND THE FINAL AUTHORITY IN MATTERS, SPIRITUAL AND ETHICAL IS ONLY ONE SIDE OF THE STORY. {۴}

"قرآن روحانی اور اخلاقی امور میں اسلام کی اساس اور قول فیصل کے طور پر جو اثر رکھتا ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے"۔

فرانسیسی مستشرق گولڈ زیہیر (GOLDZIHER) کا یہ اعتراف بھی صداقت پر مبنی ہے :

IT IS THE HOLY WRIT OF ISLAM, REGARDED BY MUSLIM ORTHODOXY AS THE ETERNAL WORD OF GOD, KALAMULLAH REVEALED TO THE PROPHET MOHAMMAD FOR PREACHING IT TO ALL PEOPLE. {۵}

"یہ مذہب اسلام کی ایک مقدس کتاب ہے جسے مسلم اعتقاد کے مطابق خدا کا ابدی کلام یعنی کلام اللہ مانا جاتا ہے۔ یہ محمد ﷺ پر نازل ہوا تا کہ پوری انسانیت کو (رشد و ہدایت کا) سبق سکھایا جائے"۔

قرآن کی دینی عظمت

یہ کتاب مقدس تعلیمات کا مجموعہ ہے' ہدایت و رہنمائی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اختلافات و امتیازات ختم کر کے ایک شاہراہ پر گامزن رکھنے کا ذریعہ ہے۔ یہ تاریکیوں کا پردہ چاک کرنے کا محرک اور کائنات و مسائل زندگی کی مخفی اشیاء کی توضیح و تشریح کا سامان فراہم کرنے والی کتاب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ قرآن پاک ہادی اور مرشد ہے' مؤدّب اور معلم ہے' منذر اور مبشّر ہے' مُصلح اور معوّم ہے' محسن اور مبین ہے' نیز مجمل اور مفصل ہے۔ سورۃ البقرہ میں اس کتاب سے متعلق فرمان ہے : "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيهِ" (البقرہ : ۲) (یہ الکتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے) ایک جگہ فرمایا گیا : "هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ" (الانعام : ۱۵۵) (یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے بابرکت بنا کر نازل کیا ہے بس اس کا اتباع کرو) ایک جگہ اور اس کتاب عظیم کو اعمال و افعال کا رجسٹر کہا جاتا ہے : "وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" (یونس : ۶۱) (چھوٹی بڑی ہر چیز اس کتاب میں درج ہو گی)' ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے : "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" (ابراہیم : ۱) (یہ ایک کتاب ہے جسے میں نے تمہاری طرف اتارا تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ)۔ ایک جگہ اختلافات و تنازعات کا سدباب کرنے والی کتاب قرار دیا گیا' جیسے فرمایا : "وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ" (النحل : ۶۴) (ہم نے تم پر قرآن مجید اس لئے نازل کیا ہے کہ تم ان کے لئے اس چیز کو واضح کر دو جس میں اختلاف ہو گیا ہے) ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے : "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً" (النحل : ۸۹) (ہم نے تم پر قرآن مجید نازل کیا ہر چیز کی وضاحت' سراپا ہدایت اور رحمت کے طور پر)

قرآن پاک کی شرعی اور دینی حیثیت اس کتاب کے ہر ہر صفحہ پر بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریقوں سے پوری طرح عیاں ہے۔ اس ضمن میں چند مندرجہ ذیل

ارشاداتِ نبوی بھی ملاحظہ کئے جائیں۔

حضرت حارث الاعور سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ فتنے برپا ہوں گے۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول پھر ان فتنوں سے نکلنے کا کیا ذریعہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کتابُ اللّٰہ" کیونکہ اس میں تم سے قبل کے حالات، تم سے بعد کی چیزیں اور تمہارے مابین واقع ہونے والے معاملات درج ہیں اور وہ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کوئی ہزل یعنی ظرافت، ہنسی اور مذاق نہیں ہے۔ جو شخص اسے چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کردے گا، اور جو شخص کسی اور کتاب میں ہدایت کو تلاش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کردے گا۔ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔ وہی ذکر حکیم اور وہی صراط مستقیم ہے۔ قرآن ہی ایسی چیز ہے جو نفسانی خواہشات کو لغزش میں نہیں لا سکتی۔ زبانیں اس کے ساتھ گڈمڈ نہیں ہو سکتیں اور اس کی جانب دعوت دینے والا راہ راست کی طرف ہدایت پاتا ہے"۔ {۶}

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "بلاشبہ وہ آدمی جس کے سینے میں قرآن پاک کا کوئی حصہ (محفوظ) نہیں ہے اس گھر کی طرح ہے جو ویران ہو گیا ہو"۔ {۷}

دارمیؒ نے عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ

"اللہ پاک کے نزدیک آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے ان سب سے قرآن ہی زیادہ محبوب ہے"۔ {۸}

شیخینؒ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تم میں سے اچھا (اور ایک روایت میں افضل) وہ شخص ہے جو قرآن کو سیکھے اور اسے دوسروں کو سکھائے"۔ {۹}

قرآن پاک کی ادبی حیثیت

قرآن ایک مکمل ضابطہ زندگی ہے جسے اللہ عزوجل نے پوری انسانیت کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ حق و باطل، جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں اس کی حیثیت فرقان کی

ہے۔ یہ کتاب انسانیت اور بشر دوستی کا سبق سکھاتی ہے' ظلم وعدوان کے خلاف آواز بلند کرتی ہے' تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتی ہے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کے قلادے کو بنظر حقارت دیکھتی ہے اور انسانیت کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ قرآن کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب انقلاب بھی۔ یہ ایسی تعلیمات کا مخزن ہے جن کے ذریعہ حقیقی معنوں میں زندگیاں انقلاب آشنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ قرآن پاک کا دینی اور شرعی پہلو ہے۔ اس کا ادبی پہلو بھی دنیا کی دیگر تالیفات و تصنیفات کے مقابلے میں فصاحت و بلاغت کی ثریا کو پہنچا ہوا ہے۔ قرآن پاک جب نبی اکرم ﷺ پر اترا تو فی الحقیقت اس نے تمام منافی اسلام اعمال و مظاہر پر ضرب لگائی اور جاہلیت [10] کی بنیاد پر قائم کی گئی عمارت زمیں بوس ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے جاہلیت کے ان علمبرداروں کو زیر کر دیا جو فصاحت و بلاغت کے معاملے میں اپنے علاوہ دوسروں کو گونگا کہتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ فکری اور نظریاتی دونوں لحاظ سے قرآن پاک نے جاہلیت کے نام لیواؤں کو چیلنج کیا۔

اپنی شہرت یافتہ تصنیف ہسٹری آف دی عربس میں مشہور مستشرق "فلپ کے حٹی" لکھتے ہیں :

> *"THOU THE YOUNGEST OF THE EPOCH MAKING, THE QURAN IS THE MOST WIDELY READ BOOK EVER WRITTEN, FOR BESIDES ITS USE IN WORSHIP, IT IS THE TEXT BOOK FROM WHICH EVERY MUSLIM LEARNS TO READ ARABIC."* [11]
>
> "اگرچہ قرآن مجید عہد آفریں کتابوں میں سب سے کم عمر ہے۔ لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے کیونکہ عبادت میں اس کے استعمال کے علاوہ یہ ایک درسی کتاب ہے جس کے ذریعہ مسلمان عربی زبان پڑھنا سیکھتا ہے"۔

چنانچہ قرآن مجید ایک طرف دینی اور مذہبی سرمایہ ہے تو دوسری طرف زبان و ادب کے لحاظ سے بے مثل نمونہ ہے۔ زبان و ادب کے اسی دائرے میں ہی قرآن پاک کا اصل اعجاز دیکھا جا سکتا ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ قرآن ایک

معجزہ ہے جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کیا گیا۔ یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن کسی مخصوص وقت اور کسی محدود خطۂ ارض کے لئے ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے اور پوری انسانیت کے لئے معجزہ ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کی بعثت پوری دنیا کے انسانوں کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہوئی اس لئے یہ کتاب بھی جو بطور معجزہ آپؐ کو نوازی گئی عالمگیر اور ابدی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ صفِ اول کے علماءِ عرب کا اس کلام ربانی کے سامنے عجز و درماندگی کا ثبوت دینا ہی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ یہ قرآن رہتی دنیا تک کے لئے معجزہ ہے' کیونکہ انہیں اپنی فصاحت لسانی پر ناز تھا اور زبان و بیان کے لحاظ سے ہمہ دانی کے مدعی تھے مگر اس کے مقابلے میں کوئی ایک چیز ایسی نہیں پیش کر سکے جسے دنیا قرآن کے فکری و فنی اعجاز کے ہم پلہ سمجھتی۔

وجہِ اعجازِ قرآن کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں۔ کچھ حضرات تو موضوع و مقصد کی بلندی و پاکیزگی کو قرآن کی اصل وجہ اعجاز قرار دیتے ہیں تو بعض دوسرے علماء نیرنگی مضامین و مطالب اور پیشین گوئیوں کی موجودگی کو۔ ادباء کا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو دلکش فصاحت' پر زور طرز استدلال' حیرت انگیز بلاغت نیز واضح اور مبرہن مسلک کو سبب اعجاز بتاتا ہے۔ قرآن پاک کے اعجاز کے سلسلے میں مذکور الاول دونوں آراء کے مقابلے میں تیسری رائے کے اندر بڑی موزونیت ہے۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عرب مخاطب تھے وہ جاہلیت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے فکر و خیال کا دائرہ محدود تھا۔ حق و ناحق' صحیح و غلط اور جائز و ناجائز ان تمام حدود کو پھلانگ جاتے تھے اور نہ ہی وہ اس بات کے مدعی تھے کہ علم غیب ان کی میراث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی بھی فلسفی اور عالم الغیب ہونے کا انہوں نے دعویٰ نہیں کیا۔ دعویٰ جب بھی کیا تو اپنی فصاحت و بلاغت کا۔

یہ سچ ہے کہ وہ زبان و بیان کے شہسوار تھے۔ اس میدان میں ان کا کوئی مثیل و معاند نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فصاحت و بلاغت کا امام و پیشوا سمجھتے تھے اور غیر عرب کو اپنے سامنے گونگا اور بے زبان کہہ دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید کا اعجاز وسعت فکر و نظر' خوبی تراکیب' مضامین کی بلندی'

موضوعات کی نیرنگی، پیشین گوئی اور دوسری تمام فکری اور فنی خصوصیات کو محیط ہے۔ لیکن قرآن پاک کی اصل وجہ اعجاز اس وقت تک سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ نزول قرآن کے وقت مخالفین و مشرکین کے حالات کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ قرآن اگر موضوعات کی بلندی، نیرنگی مضامین اور پیشین گوئیوں کے لحاظ سے بلندیوں پر ہے تو اسے اصل معجزہ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عرب کبھی بھی فکر و نظر کی وسعت و ہمہ گیری اور بلندی و پختگی پر نازل و فاخر نہ تھے۔ اگر وہ ہمہ دانی کے مدعی تھے تو زبان و بیان کے دقیقہ شناس ہونے کی حیثیت سے اور قرآن پاک نے ان کے اس زعم کو بھی توڑ دیا۔ شاعری کے امام اور قدرت بیان میں لاثانی عرب اس کلام کو سننے کے بعد محو حیرت ہو گئے۔ انہوں نے اسے نہایت عجیب و غریب چیز قرار دیا۔ وہ ششدر و سراسیمہ اور حیران و پریشان تھے کہ کلام کے مروجہ اقسام میں اسے کس صنف میں شمار کیا جائے۔ انہوں نے اضطراب و بے چینی کی حالت میں کبھی اسے شاعری کہا' (الانبیاء : ۵) کبھی سحر قرار دیا (الاحقاف : ۷) اور کبھی کاہنوں کی سجع بندی (الطور : ۲۹) سے تعبیر کیا۔ قرآن پاک کو ان اصناف کلام میں شمار کرنا جو ان کی حواس باختگی کا سبب بنیں، فن و ادب کے لحاظ سے اعجاز قرآن کا درخشاں ثبوت ہے۔

عرب کے اس معاشرے میں جب کہ نزول قرآن کا مبارک سلسلہ جاری تھا کفار و مشرکین اس کلام الٰہی کو انسانی کلام قرار دینے پر بضد تھے۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ اسے حضور اکرمؐ کی ذات، آپ کے اصحاب اور کچھ ماہرین فن کی طرف منسوب کر دیں۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ کوئی انسانی کلام نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ان کی جاہ و حشمت پر ضرب پڑ رہی تھی، کرسی و اقتدار چھن رہا تھا اور آباء و اجداد کے دین کا قصر پیوند خاک ہو رہا تھا اس لئے کلام مقدس کو بے وزن بنانے کے لئے اسے انسانی کاوش قرار دیا اور بیک وقت آپ کی نبوت کی تکذیب کے لئے دو حربے استعمال کئے۔ ایک طرف تو نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب پر بے جا اعتراضات کے وار کئے گئے اور ان کی شخصیتوں کو نشانہ تضحیک بنایا گیا اور دوسری طرف قرآن پاک کی طرف انگشت نمائی کرتے ہوئے کہا گیا کہ ہم بھی ایسا کلام پیش کر سکتے ہیں۔ جب قرآن کے مالک کو کفار و

مشرکین کی یہ ادا پسند نہ آئی تو علی الاعلان یہ کہہ دیا ﴿اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الصافات : ۱۵۶، ۱۵۷) "یا پھر تمہارے پاس (اپنی ان باتوں کے لئے) کوئی واضح سند ہے تو لاؤ اپنی کتاب اگر تم سچے ہو"

تاریخ شاہد ہے کہ قرآن پاک کے اس چیلنج پر وہ خاموش رہے، تب پھر قرآن پاک نے صرف اس جیسی دس سورتوں کے پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ فرمایا : "قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ" (ہود : ۱۳) (اے نبیؐ! آپؐ فرما دیجئے کہ تم لوگ اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں ہی لے آؤ) ممکن ہے پوری کتاب یا اس جیسی دس سورتیں پیش کرنا دقت طلب یا دشوار گزار ہو اس کے پیش نظر قرآن پاک نے انہیں رخصت دی اور پھر کہا کہ ایک ہی سورۃ لے آؤ۔ قرآن کا یہ بیان سنئے :

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ... ﴾ (البقرہ : ۲۳)

"ہم نے جو کچھ اپنے بندے (محمد عربیؐ) پر نازل کیا ہے اگر اس سلسلے میں تم شک و ریب میں مبتلا ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورۃ ہی لے آؤ"

قرآن کے مثل پوری ایک کتاب پیش کرنا یا دس سورتیں لے آنا تو دور کی بات تھی وہ ایک سورۃ بلکہ ایک آیت بھی پیش کرنے سے عاجز و قاصر رہے اور قرآن کے مالک نے ان کی سرتاپا عجز و درماندگی کو دیکھ کر تمام جن و انس کے لئے چیلنج کر دیا جو قیامت تک کے لئے ہے۔ فرمایا :

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝﴾ (الاسراء : ۸۸)

"کہہ دیجئے (اے نبیؐ!) اگر تمام جن و انس ایکا کر لیں اس بات پر کہ وہ اس قرآن کا مثل پیش کر دیں گے تو اس جیسا کلام کبھی پیش نہیں کر سکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں"۔

تاریخ شاہد ہے کہ قرآن مجید کے ان چیلنجوں کے سامنے زبان و بیان کے ائمہ عرب

مجبور محض ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے انتھک جدوجہد کی کہ اس جیسی کتاب پیش کر کے محمد عربی ﷺ پر نازل شدہ خدائی کتاب کو انسانی کاوش و تخلیق کا مظہر قرار دیا جائے لیکن ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ انہیں شکست و ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا۔ قرآن نے ان کے دعوائے محض اور خواب خیالی کو پیش کرتے ہوئے ان کی بے بسی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے: "لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا" (الانفال : ۳۱) (اگر ہم چاہیں تو اس جیسا کلام کہہ سکتے ہیں) اور صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ قرآن پاک پر کیچڑ اچھالنے اور اس کتاب مقدس کو انسانی کاوشوں کی طرف منسوب کرنے والے لوگ بھی قرآن کے چیلنج کے مطابق کچھ پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ ایک دن نہیں بلکہ حیات طیبہ کی طویل مدت تک مطالبہ کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگوں کا لامتناہی سلسلہ بھی چل پڑا' رشتے ناطے کٹ گئے' احوال و اسباب تلف ہو گئے' قیمتی جانیں چلی گئیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کا معارض پیش کرنے پر قادر ہوتے تو جانوں' مالوں اور عزتوں کا لٹ جانا گوارا نہ کرتے۔

تاریخ میں بہت سارے واقعات ہیں جن سے قرآن کے اصل اعجاز کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ بالاختصار چند واقعات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :

واقعات کی فہرست میں ایک واقعہ ولید کا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ قرآن کے خلاف ابوجہل نے ولید کو کچھ کہنے کا حکم دیا تو اس پر اس نے کہا کہ میں کیا کہوں۔ خدا جانتا ہے کہ تم لوگوں میں مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص شعر' رجز' قصیدہ اور اشعار جاننے والا نہیں ہے۔ مگر واللہ جو بات وہ کہتا ہے ان میں سے کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی اور واللہ محمد ﷺ کے قول میں جس کو وہ پیش کرتے ہیں شیرینی اور لطافت ہے اور اس کلام کا بالائی حصہ ثمردار ہے تو اس کا زیریں حصہ شکربار اور اس میں شک نہیں کہ وہ کلام ضرور بالاتر ہو گا اور اس پر کسی کو بلندی حاصل نہ ہو گی' اور یہ بھی یقینی ہے کہ وہ اپنے سے کمتر درجہ والی چیزوں کو پامال کر دے گا۔ [۱۲]

ایک دوسرا واقعہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ حضرت عمرؓ قبول اسلام سے پہلے گروہ کفار کے سرکردہ تھے لیکن جب اپنی بہن کی زبانی سورۃ طٰہٰ کی

چند آیات پردۂ سماعت سے ٹکرائیں تو وہ سیدھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی عاجزی سے درخواست کی کہ مجھے بھی دولت اسلام سے سرفراز فرمائیں۔ {۱۳}

تیسرا واقعہ ہجرت حبشہ سے متعلق ہے۔ جب ظلم و ستم کی چکیوں میں پیسے جانے والے اصحاب نبیؐ دعوت و تبلیغ کے لئے حبشہ کو ہجرت کرتے ہیں تو نجاشی کے دربار میں سورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نجاشی پر ان آیات کریمہ کا جو اثر ہوتا ہے اسے حق و صداقت کی تاریخ میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ {۱۴}

خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار میں بھی مسیلمہ کذاب اور سفاح نامی لوگوں نے قرآن کی تکذیب کرتے ہوئے انکار نبوت پر بھی اصرار کیا اور بعد کی صدیوں میں بھی قرآنی چیلنج کو قبول کرنے کے لئے سعی نامشکور کا سراغ ملتا ہے' اس سلسلے میں عبداللہ بن مقفع کا واقعہ {۱۵} بہت مشہور اور عجیب و غریب ہے۔ اس واقعہ سے متعلق ایک مستشرق کا بیان سنئے :

> *·THE LITERACY EXCELLENCE OF THE QURAN WAS NOT UNFOUN DED IS A FURTHER EVIDENCE BY A CIRCUMSTANCE WHICH OCCURED ABOUT A CENTURY AFTERTHE ESTABLISHMENT OF ISLAM·.* {۱۶}
>
> "قرآن کے ادبی کمال سے متعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے۔ اس کی صداقت ایک ایسے واقعے سے ثابت ہو جاتی ہے جو قیام اسلام کے تقریباً ایک صدی بعد وقوع پذیر ہوا"۔

واقعہ یہ ہے کہ منکرین مذہب نے دیکھا کہ قرآن اپنی شیرینی و دلاویزی سے اذہان و قلوب کو متاثر کرتا جارہا ہے اور مذہب کی شعاعیں روز بروز کرۂ ارض پر بکھرتی جارہی ہیں تو انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی ساری توجہات عبداللہ بن مقفع کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ چونکہ یہ بڑا زبردست انشاءپرداز اور اپنے زمانے کا ذہین و طباع ادیب تھا۔ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ لہٰذا وہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور اس نے یہ عہد کیا کہ وہ ایک سال کے

اندر ہی یہ مہم سر کرلے گا۔ البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس کے لئے ضروریات کی ساری چیزیں فراہم کردی جائیں تا کہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اس عہد و میثاق کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اس کے مطالبات کے مطابق ضروریات کی اشیاء فراہم کردی گئیں اور اس نے اپنی اس مہم کا آغاز کردیا۔ جب نصف مدت گزر گئی تو اس کے ساتھیوں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کام کہاں تک پہنچا ہے۔ چنانچہ جب وہ اس کے پاس گئے تو اس حال میں پایا کہ وہ عجز و درماندگی کی حالت میں بیٹھا ہوا ہے۔ قلم اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کے پاس پھاڑے ہوئے کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس فصیح اللسان ادیب نے اپنی پوری قوت صرف کر کے قرآن کا جواب لکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور اس نے انتہائی عاجزی و پریشانی کے عالم میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ صرف ایک فقرہ لکھنے کی جدوجہد میں اس کے چھ ماہ گزر گئے مگر وہ کچھ نہ لکھ سکا اور پھر نا امید و شرمندہ ہو کر اس خدمت سے دستبردار ہو گیا۔ {۱۷}

مذکورہ بالا چند واقعات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ایک معجزہ ہے۔ کوئی شخص بھی اگر اس کی تعلیمات کو شکوک و شبہات کا ہدف بناتا ہے یا اس کے خدائی کلام ہونے کا انکار کرتا ہے تو اس کے انکار کی معنویت اور اس کے دعویٰ کی صداقت اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس معجزہ مقدس کلام کا ثانی پیش کردے۔ قرآن کے چیلنجز پر کفار و مشرکین کا رویہ جو بھی رہا ہو حقیقت یہی ہے کہ "لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا" کی رٹ لگا کر اپنی عاجزی کا ثبوت پیش کرتے رہے اور عملاً بھی انہیں شکست و ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حجت باقی رہی اور معجزہ ثابت ہو گیا۔ {۱۸}

غیر مسلم علماء کے تاثّراتِ قلبی

قرآن پاک کی فکری اور فنی حیثیت پر مسلمانوں کے علاوہ دیگر افکار و مذاہب سے منسلک افراد بھی اپنے قلبی تاثرات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے جس فراخی ذہن اور کشادہ ظرفی کے ساتھ قرآنی فکر و فن کی عظمت پر گویائی کی ہے یہ پہلو بھی

قرآن پاک کے اعجاز کو ثابت کرتا ہے۔

Karlonalinues نے اپنی کتاب "تاریخ آداب العربیہ" میں لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں ادب و انشاء کی اس شاہراہ پر گامزن نہ ہو سکے تھے جو بعد میں قرآن پاک کے ذریعہ تیار کی گئی تھی[۱۹]۔

مشہور یورپین مورخ حتی قرآن پاک کو فکر و فن کا راہبر و راہنما قرار دیتے ہوئے گویا ہے :

·AT THE TIME OF MOHAMMAD THERE WAS NO WORK OF THE FIRST ORDER IN ARABIC PROSE; THE QURAN WAS THEREFOR THE EARLIEST, AND HAS EVER SINCE REMAINED THE MODEL PROSEWORK. ITS LANGUAGE IS RHYTHMICAL AND RHETORICAL, BUT NOT POETICAL. ITS RHYMED PROSE HAS SET THE STANDARD WHICH ALMOST EVERY CONSERVATIVE ARABIC WRITER OF TODAY CONCIOUSLY STRIVES TO IMITATE·[۲۰]

"محمد ﷺ کی بعثت کے وقت عربی نثر کا باضابطہ سرمایہ موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کو پہلا مدون عربی نثر ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ قرآن (عربی نثر کا) ہمیشہ نمونہ بنا رہا۔ اس کی زبان مسجع اور مقفی ہے لیکن شاعرانہ یا منظوم نہیں۔ اس کے مقفی نثر نے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس کی تقریباً ہر قدیم مصنف آج بھی نقل اتارنے کی جدوجہد کر رہا ہے"۔

گولڈ زیہر (Goldziher) ایک فرانسیسی عالم ہے اس کی بہت ساری باتیں تعصب اور جانبداری پر مبنی ہیں لیکن اسلام اور قرآن سے متعلق اس کی بعض باتیں دیانت دارانہ رجحان کی غماز ہیں۔ قرآن پاک کے سلسلے میں وہ اپنی کتاب میں ان الفاظ میں مدح خواں ہے :

·THE PREACHING OF MOHAMMAD INVOLVING THE REFORMS OF RELIGION AND SOCIAL LIFE, ARE SUMMERICAL IN LITERACY FROM IN A BOOK WHICH APART FORM ITS GREAT SIGNIFICANCE IN THE HISTORY OF RELIGION IS ALSO REMARKABLE, BEING

THE FIRST BOOK IN ARABIC, THIS IS THE QURAN. {۲۱}

"مذہب اور سماجی زندگی کی اصلاحات پر مشتمل محمد صلی اللہ علیہ کی تعلیم کا خلاصہ ادبی شکل میں ایک کتاب کے اندر موجود ہے جو تاریخ مذاہب میں عظیم اہمیت کی حامل ہونے کے علاوہ عربی ادب میں بھی ایک قابل ذکر کتاب ہے اور عربی میں پہلی کتاب ہے جس کا نام قرآن مجید ہے"۔

جرجی زیدان کے بقول :

"قرآن مجید کا ادبی کمال اور اس کی اثر انگیزی اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب ہم اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ صرف اس کی عظمت کی بناء پر ہی عربی بولنے والی مختلف قوموں کی مقامی بولیاں جداگانہ زبانیں نہیں بننے پائیں۔ جس طرح ممالک یورپ میں رومانی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں"۔ {۲۲}

پروفیسر نکلسن کے اس خیال میں وزن ہے کہ قرآن کے اثر سے عربی زبان تمام اسلامی دنیا کی متبرک زبان بن گئی"۔ {۲۳}

ڈاکٹر جانسن کا یہ تاثر بجا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے مطالب ایسے مناسبت وقت کے حامل اور عام فہم ہیں کہ دنیا انہیں آسانی سے قبول کر سکتی ہے"۔ {۲۴}

دیومت شاستری ایک ہندو محقق اور مبصر ہیں۔ ان کی اس رائے میں صداقت ہے کہ

"قرآن پر ہر ذی شعور عالم اس لئے فریفتہ ہوتا ہے کہ اس میں دل کو چھو لینے والا انوکھا انداز ہے' شدت' زور اور خطابت ہے' نیا نظریہ اور نئی چنتا ہے۔ قرآن سوچ اور فکر کے لئے ایک نیا تصور پیش کرتا ہے۔ کسی بھی ذی فہم مفکر کو قرآن کا اسٹائل' اس کی گرامر اور قوت گویائی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے"۔ {۲۵}

قرآن کریم ضابطہ زندگی اور سرچشمہ ہدایت ہے۔ ساڑھے چودہ سو سال قبل جبکہ ہر خطہ ارض کفر و شرک اور الحاد و بے دینی کی لپیٹ میں تھا۔ اخلاق' انسانیت نوازی' اور بشر دوستی کی ساری قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ سیاست و معیشت اور تمدن و معاشرت کے معیارات فاسد ہو چکے تھے۔ بالخصوص عرب کا خطہ تمام قسم کی جہالتوں کا مرکز تھا۔ اس پر آشوب ماحول میں نزول قرآن کا مقدس سلسلہ سراپا نور و ہدایت ثابت ہوا۔ اس نے

انسان کو تاریکیوں سے نکال کر منارۂ نور دکھایا اور عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے انسانیت کو درخشاں اور منور کیا۔ گویا مشرق و مغرب کے چپے چپے میں اپنے انوار کی تجلیوں سے قرآن نے ہر شعبہ زندگی میں انقلاب برپا کیا اور اس طرح اولاد آدم کو انسانیت کی معراج نصیب ہوئی۔

قرآن پاک کے فکری انقلاب کے اس درخشاں پہلو کے علاوہ قرآن پاک کا ادب بھی عروج کی انتہاؤں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ قرآن جس خطہ ارض میں اپنے انوار کی کرنیں بکھیر رہا تھا وہ فکری لحاظ سے چاہے بنجر ہو لیکن فن و ادب کے لحاظ سے زرخیز و شاداب تھا۔ دنیائے علم و فن کی امامت و پیشوائی کے دعویدار فصحائے عرب اپنے علاوہ دوسروں کو زبان و بیان کے لحاظ سے نااہل بلکہ گونگا قرار دیتے تھے۔ قرآن مقدس نے ان کے علمی پندار کو توڑ دیا۔ قرآنی ادب کی عظمت کے سامنے ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں' اعضاء و جوارح شل ہو گئے اور ان کے ذہن و دماغ کا توازن کھو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ چاہے فکری لحاظ سے قرآن کی حیثیت دیکھی جائے یا پھر زبان و ادب کی میزان پر اسے تولا جائے ہر دیدۂ بینا جو تعصب کی عینک اتار کر صداقت پر نظر رکھتا ہو یہ کہنے پر مجبور ہے کہ قرآن پاک ہدایت کی عالمگیر کتاب اور فکر و فن کا عظیم ترین سرچشمہ ہے۔

حوالہ جات و حواشی

{۱} انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' ج ۴' طبع جدید' ص ۹۵

{۲} جرجی زیدان' تاریخ التمدن الاسلامی' ج ۲' (اردو ترجمہ) ص ۴۴

{۳} احمد حسن الزیات' تاریخ الادب العربی' ۱۹۳۰ء مطبع الرسالہ' قاہرہ' ص ۸۰

{۴} فلپ کے حتی' ہسٹری آف دی عربس' طبع ششم' ۱۹۵۸ء' نیویارک' ص ۱۲۷

{۵} گولڈ زیہیر' اے شارٹ ہسٹری آف عربک لٹریچر' ص ۱۹

{۶} محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ الترمذی' جامع الترمذی' ابواب فضائل القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ج ۲' ص ۶۱۴

{۷} ولی الدین محمد بن عبداللہ' مشکوۃ المصابیح' فضائل القرآن' المطبع المجتبائی' دہلی' ص ۱۸۶

{۸} عبداللہ بن عبدالرحمٰن' سنن الدارمی' ۱۳۴۹ھ: دمشق' ص ۴۴۱

{۹} محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، ج ۲، ۱۹۳۸ء، دہلی، ص ۷۵۲

{۱۰} جاہلیت مادہ "ج ھ ل" سے مشتق ہے اور اسم فاعل جاہل سے صیغہ نسبت ہے۔ جاہلیت سے مراد ہے زمانہ قبل از اسلام کے عربوں کی حالت (لسان العرب) اور دعوت اسلام سے قبل بالخصوص ہجرت نبوی سے پہلے کا زمانہ۔ کیونکہ اس عہد کے جزیرۃ العرب میں مشرکین عرب کا سیاسی اور سماجی قانون مروج تھا جو کسی وحی و الہام کا پابند نہ تھا (الکشاف) قرآن پاک میں اس لفظ کا استعمال چار جگہوں پر ہوا ہے۔ آل عمران : ۱۰۴ میں ظن الجاھلیہ، المائدہ : ۵۰ میں افحکم الجاھلیہ، الاحزاب : ۳۳ میں تبرج الجاھلیہ الاولی اور الفتح : ۲۶ میں حمیہ الجاھلیہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جہل سے مراد لاعلمی کے علاوہ درشتی، سختی، بربریت، خشونت، اکھڑپن، قوانین الہیہ سے ناواقفیت اور حالت کفر و بت پرستی بھی ہے۔ عمرو بن کلثوم کے مندرجہ ذیل شعر میں اکھڑپن، درشتی اور سختی کے مفہوم کی تعبیر ملتی ہے :

الا لایجھلن احد علینا - فنجھل فوق جھل الجاھلین

جاہلیت کا پہلا دور تو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوحؑ بقول جمہور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے زمانہ تک شمار کیا گیا ہے اور جاہلیت کا آخری دور حضرت عیسیٰؑ سے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے آغاز تک کا زمانہ بلکہ بعض کے نزدیک ہجرت نبویؐ تک کا زمانہ ہے (الکشاف بحوالہ اردو دائرہ المعارف الاسلامیہ مادہ "ج ھ ل" موضوع جاھلیہ "ج ۷، طبع اول صفحہ ۸)

{۱۱} "فلپ" کے "حتی" ہسٹری آف دی عربس، طبع ششم ۱۹۵۸ء، نیویارک، ص ۱۲۶

{۱۲} سید قطب، التصویر الفنی فی القرآن، طبع سوم، دار المعارف، مصر، ص ۲۴

{۱۳} شاہ معین الدین ندوی، خلفائے راشدین ج ۱، ۱۹۷۳ء، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۹۶

{۱۴} علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، ج ۱، طبع پنجم، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۲۳۸

{۱۵} عبداللہ بن المقفع کی طرف منسوب اس واقعہ میں صداقت کی جھلک کہاں تک ہے اس بحث میں پڑے بغیر اگر اس کی دینی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگشت نمائی سے بالاتر نہیں ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کا یہ کہنا درست ہے کہ وہ مسلمان کیوں ہوا؟ اس کی حقیقی وجہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ قبول اسلام کے باوجود اس کے طرز زندگی میں فرق نہیں آیا۔ ص ۴۰۷۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ تیسری صدی ہجری کے عہد عباسی کا زبردست انشاء پرداز تھا بلکہ اس عہد کی انشاء پردازی کی امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز تھا جہاں تک اس کے زندقہ سے متعلق بات ہے وہ بڑے بڑے علماء و مورخین کے خیالات سے مصدق ہو جاتی ہے۔ مثلاً السید المرتضیٰ نے "الامالی" ج ۱، قاہرہ۔ عبدالقادر بغدادی نے خزانہ الادب، ج ۳، قاہرہ، البیرونی نے مالللہند، طبع ۱۸۷۸ء، الباقلانی نے اعجاز القرآن اور ابن

(باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۲)

تحریر : محمد المکی ناصری' ترجمہ : پروفیسر نور احمد شاہتاز

افتاء کی شرائط اور ممنوعات

اس بات پر اصولیوں کا اجماع ہے کہ ثقہ و عادل عالم کو افتاء کا اختیار ہے' جبکہ ائمہ اسلام نے ایسے شخص پر سخت ملامت کی ہے جو قلت علم یا ضعف دین یا دونوں کی موجودگی کے باوجود مسند افتاء پر چڑھ بیٹھے (۱۵) اور ایسے شخص کی شدید مذمت کی ہے جو بلا اہلیت میدان افتاء میں دم مارنے لگے اور لاعملی کے باوجود فتاویٰ صادر کرنے لگے' یا خلاف علم اپنی خواہش یا کسی دوسرے کی خواہش کے مطابق فتاویٰ جاری کر دے' یا سستی شہرت کی خاطر یوں فتویٰ دے کہ حلال کو حرام یا حرام و ناجائز کو حلال اور جائز بتلائے۔ یا کسی قول شاذ کو حجت قرار دے کر اس سے استدلال کرے اور اسی پر فتویٰ دے۔ مفتی کو یہ چاہئے کہ وہ سوال کا جواب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا جواب اس حکم شرع میں اسی طرح ثابت شدہ ہے جیسا وہ کہہ رہا ہے۔ یوں مفتی کی حیثیت "جبکہ اس کا تعلق مجتہدین سے ہو" ایک ایسے مخبر کی ہوگی جو سائل کو قرآن و سنت سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کتاب و سنت کا حکم سنا رہا ہو یا اس کی حیثیت ایسے مخبر کی ہوگی جو امام فی المذہب کی فقہی آراء و نصوص سے مسائل کے سوال کا جواب اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دے۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کا تعلق مقلدین سے ہو۔ جیسے کوئی مجتہد سوائے اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے کتاب و سنت سے سیکھا ہے اسی طرح کوئی مقلد اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے اس امام فی المذہب کے مذہب سے سیکھا ہو جس کا وہ مقلد ہے۔

اس طرح جب کسی مفتی کو کسی استفتاء کے موضوع کے بارے میں مکمل معلومات مل جائیں اور وہ سوال کا حل یقین یا غلبہ ظن کی بناء پر نکال لے تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے مطابق جواب دے اور سوال کا صحیح حل مل جانے اور استفتاء کا درست جواب معلوم ہو

جانے کے باوجود اس سے اغماض برتنا اور اس کے خلاف فتویٰ دینا حرام ہے۔ ایسا کرنے والا شخص ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہوگا جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ : "یقولون علی اللہ مالا یعلمون" نیز "قل انما حرم ربی الفواحش .....الی قولہ تعالی : وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون"

اور جب کسی نے علم کے خلاف فتویٰ دیا تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے : "ویوم القیمہ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودہ"

اگر کسی میں وصف علم بغیر عدالت کے پایا جائے تو اسے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں، کیونکہ اس کے اور فتویٰ کے درمیان فسق حائل ہے اور وہ اس لئے کہ فتویٰ کا تعلق امور دینیہ سے ہے جبکہ فاسق کی بات امور دین میں قابل قبول نہیں (۱۶)۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد فاسق معلن اور مبتدع ہے جس کا فتویٰ صحیح نہیں (۱۷) جیسے روافض کہ جو سلف صالح پر سب وشتم کرتے ہیں چنانچہ ان کے فتاویٰ مردود ہیں اور ان کے اقوال ساقط الاعتبار ہیں۔ جیسا کہ نووی نے صیمری کا قول "المجموع" میں نقل کیا ہے۔ (۱۸)

افتاء اور استفتاء کا حکم

ہر مسلم مرد و عورت کو ایسا کوئی بھی کام جو امور دین میں سے ہو شروع کرنے سے قبل سوچنا ہوگا کہ ان کا یہ عمل شرعاً حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز؟ اگر انہیں اس کا علم ہے تو فبہا اور اگر وہ اس کا شرعی حکم نہیں جانتے تو انہیں کسی ایسے صاحب علم سے رجوع کرنا ہوگا جو فتویٰ دینے کا اہل اور مجاز ہو، بتقضائے امر الٰہی "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ○" اس کے بعد ہی مزعومہ امر کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر وہ امر شرعاً جائز ہو تو اسے باطمینان قلب انجام دیا جائے گا اور اگر ممنوع یا ناجائز ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے گا۔

اور جب کوئی مسلمان امور دینیہ کے سلسلہ میں کوئی سوال کسی ایسے عالم سے کرے کہ اس علاقہ میں اس کے سوا اور کوئی عالم نہ ہو تو اس عالم کو چاہئے کہ وہ پوری

احتیاط کے ساتھ ادلہ شرعیہ کے مقتضی کے عین مطابق اس سوال کا جواب دے کہ ایسا کرنا شرعاً اس پر واجب ہے اور اگر اس علاقہ میں ایک سے زائد ایسے علماء ایک ہی مجلس میں موجود ہوں جو فتویٰ دینے کے اہل ہوں تو اب ان تمام پر اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھی یہ ذمہ داری قبول کر لے تو تمام پر سے وجوب ساقط ہو جائے گا جیسا کہ دیگر فرائض کفایہ میں معروف ہے۔ لیکن اگر سائل کو ان میں سے صرف ایک ہی مفتی دستیاب ہو تو اس ایک پر اس کا جواب دینا فرض عین ہے[۱۹]۔

اور اگر سائل کے علاقہ میں صرف ایک متفقہ پایا جائے جو کہ مفتی نہ ہو اور اس میں مفتی ہونے کی استعداد (ABILITY) نہ ہو اور سائل کو باوجود تلاش بسیار کے کوئی مفتی نہ مل سکے تو اسے اس صورت میں اسی متفقہ سے رجوع کرنا ہوگا اور اسی سے مسئلہ کا حل طلب کرنا ہوگا کہ ایسا کرنا کم از کم اس سے بہتر ہے کہ وہ بغیر شرعی حکم معلوم کئے شک وارتیاب کے عالم میں کسی امر پر عمل پیرا ہو اور سائل کا مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں کوشش وکاوش کرنا باوجودیکہ اسے کوئی اہل علم نہ ملے' یہ بھی تقویٰ کی وہ حد ہے جسے اللہ نے "فاتقوا اللہ ما استطعتم" فرمایا ہے۔[۲۰]

اور اگر مستفتی پر کسی ایسی جگہ کوئی افتاد آن پڑی کہ جہاں نہ تو کوئی مفتی' مجتہد ہے اور نہ مقلد' تو ایسی صورت میں اس سے اس افتاء کا شرعی حکم معلوم کرنے کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی اور یہ اس شخص کی مانند ہوگا جسے دعوت نہیں پہنچی۔ اگرچہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ مکلف ہے۔ تاہم اسے اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہئے کہ فطرت سلیمہ اور ضمیر زندہ اسے حق کی طرف رہنمائی کریں گے۔[۲۱]

بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عالم اس مخصوص صورت حال کا شرعی حکم نہ جانتا ہو جس سے سائل دوچار ہوا ہے تو عالم کو چاہئے کہ وہ مستفتی کے سوال کا جواب نہ دے۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ واقعتاً استفسار کسی ایسی صورت سے متعلق ہو جو کہ حقیقتاً درپیش ہو مگر عموماً پیش نہ آتی ہو' نہ کہ فقط کسی صورت کے امکانات سے متعلق ہو یا ناممکن الوقوع مسائل سے متعلق استفسار ہو۔ امام مالک سے بسا اوقات بعض مسائل کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ فرماتے کیا یہ امر واقعتاً درپیش ہے؟ اگر کہا جاتا کہ ہاں تو

جواب دیتے' بصورت دیگر جواب نہ دیتے تھے اور یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیتے کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے گی تو اللہ تعالیٰ جواب بھی ارزاں فرمادیں گے۔(۲۲)

مفتی کی خوبیاں

مفتی کا منصب امور دین میں ایک اہم منصب اور ایک حساس اجتماعی فریضہ اور سوشل ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حقیقی استعداد اور ظاہری و باطنی صفات سے متصف ہونا لازمی ہے۔

۱۔ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ کردار کا مالک اور فسق و فجور کا باعث بننے والے امور سے کلیتہ مجتنب ہو۔

۲۔ عوام الناس کے نزدیک اس کی شہرت عمدہ ہو' حق پر ثابت قدم رہنے والا اور نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کرنے والا ہو۔

۳۔ بارعب اور پروقار شخصیت کا مالک ہو۔

۴۔ صاحب بصیرت' سلیم العقل اور استنباط مسائل میں حسن تصرف کا مالک ہو۔

۵۔ لوگوں کے احوال سے واقف ہو اور ان کے مکر و فریب کو جانتا ہو' تاکہ حق و باطل کی تمیز کرسکے اور ظالم و مظلوم کو پہچان سکے۔

۶۔ وہ صرف اپنے ہی علم پر تکیہ کرنے والا نہ ہو بلکہ اپنے ہم مجلسوں سے مشورہ بھی کرتا ہو' اگرچہ اس کے ہم مجلس اس سے علم میں نسبتاً کم ہوں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس طرح کوئی ایسی صورت اس پر ظاہر ہو جائے جو اس وقت اس کے ذہن سے اوجھل ہو۔ اور مشورہ کرلینا سلف صالحین کی اتباع بھی ہے' ماسوا ان امور کے جن کا پوشیدہ رکھنا مطلوب ہو یا جن کے افشاء سے فساد کا خطرہ یا آداب معاشرت کے خلاف لازم آتا ہو۔

۷۔ اسے اپنے علم اور مفتی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا گھمنڈ نہ ہو' بلکہ وہ امور مسئولہ میں اللہ علیم و خبیر سے مدد و نصرت کا طلب گار رہے اور یہ التجا کرتا رہے کہ رب کریم اسے مسئلہ کے صحیح ترین حل تک پہنچنے میں رہنمائی فرمائے۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ وہ

جب بھی اللہ کے دروازے پر دستک دے گا تو گویا توفیق کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ (۲۳)

۸ ۔ لباس و پوشاک میں نظافت پسند ہو۔ کبھی بھی غیر شرعی وضع قطع کے ساتھ گھر سے نہ نکلے۔ القرافی کہتے ہیں کہ عامتہ الناس ظاہری شکل و صورت' وضع قطع کا بہت اثر لیتے ہیں اور اگر مفتی کا وقار و احترام ان کے دل میں نہ ہو گا تو وہ نہ تو اس کے فتاویٰ کو اہمیت دیں گے اور نہ شرعی مسائل کے سلسلے میں اس سے رجوع کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

میں ایک ایسے قاری کو پسند کرتا ہوں جو سفید لباس میں ملبوس ہو تا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں باوقار ٹھہرے اور یوں جو کچھ علوم حقہ میں سے اس کے پاس ہے اس کی بھی قدر و منزلت ہو۔ (۲۴)

ابو عبداللہ ابن بطہ اپنی کتاب "الخلع" میں امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کرتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ کوئی شخص منصب مفتی کا اہل نہیں جب تک اس میں پانچ خوبیاں نہ ہوں :

۱ ۔ نیک نیت ہو۔

۲ ۔ اس میں علم و حلم اور وقار و سکون ہو۔

۳ ۔ علم میں پختہ اور عزم میں قوی ہو۔

۴ ۔ ہیبت و وقار کا حامل ہو' ورنہ عوام اسے چباڈالیں گے۔

۵ ۔ لوگوں کے احوال سے واقفیت رکھتا ہو۔

ان خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ پانچ خوبیاں مفتی کی اصل اور اساس ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کم ہو گی تو مفتی میں اسی حساب سے اتنی ہی کمی یا نقص پایا جائے گا۔

حواشی

{۲۳} القرافی' الاحکام فی التمییز بین الفتاوی والاحکام ص ۲۶۶

{۲۴} الحصکفی' درالمختار' ج ۴' ص ۴۸

(باقی صفحہ ۱۰۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

سُورۃ البقرۃ

آیت ۹۶

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱، الاعراب کیلئے ۲، الرسم کیلئے ۳ اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۵۹ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

۲:۵۹:۱ اللغۃ

اس آیت میں بہت سے (آٹھ دس) الفاظ نئے (پہلی دفعہ) آئے ہیں۔ ہم آیت کو (مربوط ترجمہ کرسکنے کی آسانی کے لیے) چھوٹے چھوٹے نحوی جملوں کی شکل میں لکھ کر پہلے ہر ایک جملے کے

مفردات (الگ الگ کلمات) کی لغوی بحث کریں گے۔ اور آخر پر اس جملے کا ترجمہ (یا تراجم) زیر بحث لائیں گے۔ حوالے کا نمبر ہر چھوٹے جملے کا ہوگا۔

۲:۵۹:۱(۱) [وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ]

① "وَلَتَجِدَنَّهُمْ" یہ "وَ + لَتَجِدَنَّ + هم" کا مرکب ہے۔ ابتدائی "وَ" عاطفہ ہے یا استیناف کی ہو سکتی ہے ترجمہ "اور" ہی ہوگا۔ آخری ضمیر منصوب "هم" کا ترجمہ یہاں "ان کو" ہوگا۔ باقی صیغہ فعل "لَتَجِدَنَّ" مضارع مؤکد بلام ونون ثقیلہ ہے۔ اصل فعل "تَجِدُ" ہے (جس کی دال کی فتحہ (ـَ) مؤکد صیغہ کی ساخت کی وجہ سے ہے)۔ اس طرح اس فعل "تجدُ" کا مادہ "وجد" اور وزن اصلی "تَفْعِلُ" ہے اور "لَتَجِدَنَّ" کا وزن اصلی "لَتَفْعِلَنَّ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "وجَد.... یجِد" (ضرب سے) استعمال ہوتا ہے اور مختلف مصدروں کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے یہ مادہ "مثال واوی" ہے جس کے مضارع میں فا کلمہ (و) گر جاتی ہے یعنی مضارع "یَوْجِدُ" کی بجائے "یَجِدُ" آتا ہے۔ اور یوں "لَتَجِدَنَّ" کا موجودہ وزن "لَتَعِلَنَّ" رہ گیا ہے۔

● فعل "وجَد... یَجِدُ وُجودًا و وِجدانًا" کے بنیادی معنی ہیں "... کو پانا۔ پالینا" مثلاً کہتے ہیں۔ "وَجد مطلوبَہ" "اس نے اپنا مطلوب یعنی جس کی طلب تھی پالیا"۔ پھر یہ "پالینا" حسی بھی ہوتا ہے یعنی جس چیز کو حواس خمسہ میں سے کوئی حس پالے اور "وجود" عقلی بھی ہوتا ہے یعنی جسے عقل پالے اسی لیے بعض دفعہ حسبِ موقع اس فعل (وجد) کا ترجمہ "مشاہدہ کرنا" یا "قابو پانا" بھی کیا جا سکتا ہے۔

● یہ فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے تاہم عموماً یہ دو مفعول کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور دونوں مفعول بنفسہ (منصوب) آتے ہیں اور اس وقت "وجَد" گویا "عَلِمَ" (جان لیا) کے معنی میں آتا ہے یا دوسرے مفعول کو "حال" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً "وجدناہ صابرا" (ص: ۴۴) یعنی "ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا" یا "جان لیا/دیکھ لیا"۔

● مندرجہ بالا معنی کے علاوہ یہ فعل بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "وجَد - یجِد وَجدًا" کے معنی "غمگین ہونا" بھی ہوتے ہیں۔ اور "وجد یجد علیہ موجدۃً" کے معنی "... پر ناراض ہونا۔ غضبناک ہونا" ہوتے ہیں۔ اور "وجد یجد بہ وَجدًا" کے معنی "... سے محبت کرنا" بھی ہوتے ہیں تاہم ان معانی کے لیے یہ فعل قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا' بلکہ قرآن میں یہ اوپر والے معنی (پانا۔ پالینا وغیرہ) میں ہی آیا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے ہی ماضی و مضارع کے مختلف صیغے سو سے زائد

(۴:۱۰۴) جگہ آئے ہیں۔ عام عربی میں اگرچہ اس مادہ سے مزید فیہ کے افعال بھی استعمال ہوتے ہیں بلکہ بعض الفاظ (مثلاً "ایجاد") تو اردو میں بھی رائج ہیں، تاہم قرآن کریم میں اس سے مزید فیہ کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوا ہے۔

● اس طرح "وَلَتَجِدَنَّھُمْ" کا ترجمہ بنا "اور تو ضرور پائے گا ان کو" جسے بعض نے "تو دیکھے گا ان کو" (یعنی مشاہدہ کرے گا) سے ترجمہ کیا ہے۔ اور چونکہ آیت کے اولین مخاطب تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے بعض نے ترجمہ بصیغۂ احترام "پائیں گے"، دیکھیں گے" سے کیا ہے۔

(۲) "اَحْرَصَ النَّاسِ" اس مرکب کے دوسرے جزء (الناس بمعنی "لوگوں") کی لغوی تشریح البقرہ : ۸ [۲:۷:۱(۳)] میں کی جا چکی ہے۔ پہلے جزء "اَحْرَصَ" کا مادہ "ح ر ص" اور وزن "اَفْعَلَ" (افعل التفضیل والا) ہے، جو اصل عبارت میں منصوب آیا ہے (وجہ "الاعراب" میں بات ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد "حَرَصَ ... یَحْرِصُ حِرْصًا" (ضرب سے) کے بنیادی معنی ہیں "پوری طرح چھیل دینا" مثلاً کہتے ہیں : حرصتِ الماشیۃُ المَرْعٰی (مویشیوں نے چراگاہ کو صاف کر دیا یعنی کچھ نہ چھوڑا) گویا اس میں بنیادی مفہوم "شدّت اور ارادے کی زیادتی" کا ہے۔ اس فعل کے ساتھ "عَلٰی" کا صلہ آئے تو اس کے معنی "... کا بہت خواہشمند ہونا، ... کی شدید رغبت رکھنا، ... کا زبردست خیر خواہ ہونا" ہوتے ہیں۔ مثلاً حَرَص علی الرجُلِ" (اس نے آدمی کے نفع اور بھلائی کی پُرزور کوشش کی)۔ اسی فعل سے صفت مشبہ "حَرِیْصٌ" اردو میں "لالچی" کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس میں وہی "شدید خواہش" اور "ارادے کی زیادتی" کا مفہوم موجود ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغے صرف تین جگہ آئے ہیں اور اس سے مشتق اسم "حریص" اور "اَحرص" بھی ایک ایک بار وارد ہوئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ (احرص) اس فعل سے صیغۂ افعل التفضیل ہے اور یوں اس کے معنی "سب سے زیادہ حریص/بہت ہی آرزومند" ہیں اور اس طرح "اَحْرص الناس" کا ترجمہ "تمام لوگوں سے زیادہ حریص" یعنی "سب لوگوں سے بڑھ کر حریص/ریجھے ہوئے/زیادہ ہوس رکھنے والے" وغیرہ کی صورت میں ہو سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔

(۳) "عَلٰی حَیٰوۃٍ" (زندگی پر)۔ لفظ "حیٰوۃ" جس کا مادہ "ح ی ی" اور وزن اصلی "فَعَلَۃٌ" ہے کی لغوی وضاحت یعنی فعل مجرد وغیرہ پر تو البقرہ : ۲۶ [۲:۱۹:۱(۱)] میں کلمہ "یَستَحیی" کے ضمن میں بات ہوئی تھی۔ پھر خود لفظ "حیٰوۃ" بصورت "الحیٰوۃ الدنیا" البقرہ: ۸۵ [۲:۵۲:۱(۸)] میں زیر بحث آ چکا ہے۔

● یوں اس زیرِ مطالعہ حصۂ آیت (ولتجدنھم احرص الناس علی حیٰوۃ) کا ترجمہ بنتا ہے "اور تو ضرور پائے گا/ دیکھے گا ان کو سب لوگوں سے بڑھ کر زندگی / پر حریص/ کی ہوس رکھنے والے/ پر ریجھے ہوئے"۔ یعنی اسی دنیوی زندگی اور اس کی نعمتوں کے حد سے زیادہ دلدادہ اور طلبگار"

۲:۵۹:۱(۲) [وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا] اس عبارت کے ابتدائی کلمات "وَ" (اور) "مِن" (میں سے) اور "الذین" (وہ سب جو کہ) کے معانی سے آپ واقف ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان کا تو لغوی تشریح اور استعمال کا گزشتہ حوالہ بیان کرنا بھی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نیا لفظ یہاں "اَشْرَكُوْا" آیا ہے جس کا مادہ "ش ر ک" اور وزن "اَفْعَلُوْا" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "شَرِكَ ... يَشْرَكُ شِرْكَةً" (سمع سے) کے معروف معنی ہیں "... کا حصہ دار بننا" اور ایسے آدمی کو "شریک" کہتے ہیں یعنی "شِرْكَہٗ" کا مطلب ہے "وہ اس کا (کسی چیز میں) حصہ دار بن گیا"۔ اگرچہ اسی فعل کے معنی "جوتے کا تسمہ ٹوٹ جانا" بھی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے کسی قسم کا صیغۂ فعل کسی بھی معنی میں استعمال نہیں ہوا۔

● "اَشْرَكُوْا" اس مادہ سے باب اِفعال کا صیغہ ماضی جمع مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اَشْرَكَ ... يُشْرِكُ اِشْرَاكًا" کے معنی ہیں "... کو حصہ دار (شریک) بنا لینا"۔ اس کا مفعول بھی بنفسہٖ آتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے "اَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ" (طٰہٰ:۳۲) یعنی "تو اسے میرے کام میں شریک کر دے"۔ جس چیز میں حصہ دار بنایا جائے اس پر "فی" لگتا ہے جیسے اوپر کی مثال میں ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کے شریک (حصہ دار) بنانے کی بات ہو تو اسم جلالت یا اس کے لیے ضمیر پر "با (بِ)" کا صلہ لگتا ہے یعنی کہتے ہیں "اَشْرَكَ بِاللّٰهِ" "اس نے اللہ کا شریک بنایا" یا "اس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا"۔ اس شرک کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً خدا کی ذات اور اس کی صفات میں شریک بنانا یا سمجھ لینا۔ "اِشراک" کے یہ معنی اتنے معروف ہیں کہ اگر اس کے ساتھ "باللہ" نہ بھی لگا ہو تب بھی اس فعل سے "اللہ کے ساتھ شرک کرنا" ہی مراد ہوتا ہے جیسے زیرِ مطالعہ صیغہ "اشرکوا" کا مطلب ہی یہ ہوگا "انہوں نے شرک کیا اللہ کے ساتھ"

● چونکہ اہلِ عرب کا قبل از اسلام عام مذہب یہی شرک تھا انہوں نے بتوں وغیرہ کو خدا کے شریک بنا رکھا تھا لہٰذا قرآن کریم میں ان کا عموماً "المشرکون" (شرک کرنے والے) اور "الذین اشرکوا" (جنہوں نے شرک کیا) کہہ کر ذکر کیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ فعل ایک خاص معنی (ایک گروہ کا مذہب) دیتا ہے۔ اگرچہ اس کے لفظی معنی تو مطلقاً شرک کرنا" ہیں یعنی جو بھی جس قسم کا شرک کرتا ہے اور جس چیز یا شخص کو جس معاملے میں بھی اللہ کا شریک یا حصہ دار سمجھ لیتا ہے۔

● قرآن کریم میں اس مادہ سے زیادہ تر فعل کے صیغے اسی باب اِفعال سے ستر سے زائد جگہ آئے ہیں۔ ایک جگہ باب مفاعلہ کا ایک فعل آیا ہے' البتہ مشتق و ماخوذ اسماء میں فعل مجرد اور باب افتعال سے بھی بہت سے کلمات (مثلاً مشریك، شرکاء، مشرك، مشرکون وغیرہ) ۹۵ مقامات پر آئے ہیں۔ ان پر مفصل بات حسب موقع ہوگی' اِن شاء اللہ تعالیٰ

● زیر مطالعہ عبارت" ومن الذین اشرکوا" کا ترجمہ تو بنتا ہے" اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے (خدا کے ساتھ) شرک کیا"۔ تاہم اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے" مشرکین عرب" ہیں (اس سے پہلے اس زمانے کے یہودیوں کا ذکر ہوا ہے) اسی لیے بیشتر مترجمین نے یہاں ترجمہ" مشرکوں میں سے" ہی کیا ہے۔ اس عبارت کے ابتدائی "مِن" کی وجہ سے اس کا ترجمہ دو طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس پر مزید بات آگے حصہ" الاعراب" میں آئے گی۔

۲:۹۶:۵۹ [یَوَدُّ اَحَدُھُمْ]

① "یَوَدُّ" کا مادہ "و د د" اور وزن اصلی "یَفْعَلُ" ہے جس کی اصلی شکل "یَوْدَدُ" تھی، پھر دال متحرکہ ماقبل ساکن حرف علت (و) کی وجہ سے دال کی حرکت فتحہ (ـَـ) اس "و" کو دے کر ساکن "دال" کا دوسری (آخری) دال میں ادغام کر دیا گیا۔ یعنی "یَوْدَدُ = یَوَدْدُ = یَوَدُّ"۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "وَدَّ ...... یَوَدُّ وُدًّا" (باب سمع اور فتح سے) آتا ہے (یعنی یہ دراصل "وَدِدَ یَوْدَدُ"... تھا پھر ماضی و مضارع دونوں میں مضاعف کے قاعدے کے مطابق "وَدِدَ" میں پہلی دال کو ساکن کر کے اور "یَوْدَدُ" میں دال کی حرکت "و" کو دے کر ۔۔ دونوں دال مدغم کر دیئے جاتے ہیں)

اس فعل کے معنی ہیں؛ "..... کی آرزو کرنا ...... کی محبت رکھنا" یعنی کسی پسندیدہ چیز کے حاصل کرنے کی تمنا یا خواہش کرنا۔ چاہنا"۔ اس فعل سے ماضی اور مضارع کے مختلف صیغے قرآن کریم میں کل ۱۶ جگہ آئے ہیں۔ اور مزید فیہ کے باب مفاعلہ سے بھی ایک صیغہ فعل صرف ایک جگہ (المجادلہ: ۲۲) آیا ہے ان کے علاوہ بعض ماخوذ و مشتق کلمات (مثلاً وُدٌّ، وَدُود، مَوَدّۃ اور وَدٌّ وغیرہ) آئے ہیں، جن پر حسب موقع مزید بات ہوگی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

② "اَحَدُھُمْ" لفظ "اَحَدٌ" کی اصل "وَحَدٌ" ہے جس میں "و" کو الف میں بدل دیا گیا ہے۔ اور عربی میں "و" کو الف میں بدلنے کی اسماء اور افعال دونوں میں مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً "وُقِتَ" کو "اُقِتَ" (وقت مقرر پر لایا جانا) پڑھتے یا بولتے ہیں (یہ فعل المرسلات: ۱۱ میں بصورت "اُقِّتَتْ" آیا ہے) اسی طرح "وَحَدٌ" کو "اَحَدٌ" بولتے

ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کتب لغت (مثلاً البستان) میں تو مادہ "ا ح د" پر الگ بات ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کے تمام استعمالات کو بھی مادہ "و ح د" کے تحت ہی بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اکثر معاجم و قوامیس (مثل اللسان، القاموس، المفردات اور الوسیط وغیرہ) میں "ا ح د" اور "و ح د" کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، اگرچہ مادہ "ا ح د" سے نسبتاً کم الفاظ (افعال و اسماء) استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی زیادہ تر کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "الف" دراصل "و" سے ہی بدلا ہے۔ جب کہ "و ح د" وسیع مادہ ہے اس سے زیادہ افعال و اسماء استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "ا ح د" سے کوئی فعل مجرد نہیں آتا جب کہ "و ح د" سے مختلف ابواب سے فعل مجرد ہی متعدد معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور مزید فیہ بھی زیادہ "و ح د" سے ہی آتے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم میں ان دونوں مادوں سے کسی قسم کا کوئی صیغۂ فعل (نہ مجرد نہ مزید فیہ) کہیں استعمال نہیں ہوا۔ قرآن کریم میں "ا ح د" مادہ سے صرف دو لفظ "اَحَد" اور "اِحْدیٰ" مختلف صورتوں (مفرد و مرکب) اور مختلف (اعرابی) حالتوں میں ۸۵ جگہ آئے ہیں۔ جب کہ "و ح د" مادہ سے چار لفظ (وَحدَہٗ، واحد، واحدۃ اور وحید) مختلف اعرابی حالتوں کے ساتھ ۶۸ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔

● یہاں ہمارا زیر مطالعہ لفظ تو "اَحَدٌ" ہی ہے جو یہاں مضاف ہو کر آیا ہے۔ اس کا مادہ "ا ح د" سمجھ لیں (اکثر کتب لغت میں یہ اسی مادہ کے تحت ہی بیان کیا گیا ہے) یا "و ح د" (کہ اس کی اصلی شکل سب نے "وَحَدٌ" ہی لکھی ہے) بہرحال اس کا وزن تو "فَعَلٌ" ہی ہے۔ اس (اَحَدٌ) کا اردو ترجمہ "ایک" سے کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے استعمال کو سمجھانے کے لیے ساتھ ایک دوسرے ہم معنی لفظ "واحِدٌ" کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے "واحِد" کا اردو ترجمہ بھی "ایک" ہی کیا جا سکتا ہے، مگر ان دونوں (جس پر مفصل بات البقرہ: ۱۶۱ [۲:۳۹:۱(۲)] میں گزر چکی ہے) کے استعمال میں فرق ہے اور اس کو سمجھنے سے ہی "اَحَد" کے معنی واضح ہوتے ہیں۔ اس بارے میں چند اہم امور حسب ذیل ہیں:

● "اَحَد" کی جمع "آحاد" (اکائیاں) استعمال ہوتی ہے (جس کا اطلاق ا سے ۹ تک کے ہندسوں پر ہوتا ہے) "واحد" (جو "وحد" سے اسم الفاعل ہے اور جس کا مطلب ہی "ایک" ہے) کی جمع استعمال نہیں ہوتی۔ "اَحَد" کی مؤنث "اِحْدیٰ" ہے جب کہ "واحد" کی مؤنث عام قاعدے کے مطابق "واحدۃ" ہے۔ لفظ "احد" بطور صفت استعمال نہیں ہوتا بلکہ بطور صفت صرف "واحد" (یا "واحدۃ") استعمال ہوتا ہے "رجلٌ اَحَدٌ" یا "امرأۃ احدیٰ" نہیں کہتے بلکہ "رجل واحد" (ایک ہی مرد) یا "امرأۃ واحدۃ" (ایک ہی

عورت) کہیں گے۔

● دو استعمالات میں "اَحَدٌ" اور "واحِد" یکساں ہیں۔ پہلا یہ کہ صفات باری تعالیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام کے طور پر دونوں استعمال ہوتے ہیں اگرچہ بلحاظ معنی اتنا فرق ہے کہ "الاَحَدُ" (یکتا) وہ ہے (یعنی اس لحاظ سے ہے) کہ اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں (یعنی خدا بلحاظ "تعداد" بھی ایک ہی ہے۔ دو یا زیادہ نہیں ہیں) اور "الواحد" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی صفات میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں اپنی صفات میں بھی وہ "اکیلا" ہی ہے۔ دوسرا یکساں استعمال ان دونوں کا بطور عدد ہے۔ اگرچہ ابتدائی عدد (۱) کے لیے عربی میں زیادہ تر "واحد" یا "واحدۃ" استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے "واحد، اثنان... الخ یا (مؤنث) واحدۃ، اثنتان... الخ۔ تاہم "گیارہ" کے لیے "اَحَدَ عَشَرَ" برائے مذکر یا "اِحْدٰی عَشْرَۃَ" برائے مؤنث استعمال ہوتا ہے اور آگے دہائیوں کے ساتھ "اَحَدٌ وعشرون" یا "واحدٌ وعشرون" اور مؤنث کی صورت میں "احدی وعشرون" یا "واحدۃٌ وعشرون" بولتے اور لکھتے ہیں (اسی طرح باقی دہائیوں مثلاً ثلاثون، اربعون وغیرہ کے ساتھ ہوگا)

● مندرجہ بالا دو استعمالات (صفت باری تعالیٰ ہونا یا مطلقاً عدد ہونا) کے علاوہ باقی تمام چیزوں میں "احد" اور "واحد" کا استعمال مختلف ہے خصوصاً یہ کہ "احد" ہمیشہ استغراق اور جنس کی نفی میں استعمال ہوتا ہے (یعنی تھوڑے یا بہت سب کے نہ ہونے کے لیے) جب کہ "واحد" اثبات کے لیے آتا ہے مثلاً کہیں گے "مافی الدار اَحَدٌ" (گھر میں کوئی ایک مرد یا عورت بھی نہیں ہے) اگر کہیں "مافی الدار واحدٌ" تو یہ پوری طرح نفی کے معنی نہیں دے گا بلکہ مطلب ہوگا "گھر میں صرف ایک (مرد) نہیں (بلکہ زیادہ ہیں)" البتہ اثبات میں کہیں گے "فی الدار واحد" (گھر میں ایک (مرد) موجود ہے) اس (اثبات) کے لیے "فی الدار اَحَدٌ" کہنا غلط ہوگا، البتہ مضاف ہو کر استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً "فی الدار احد هم" یعنی "ان میں سے ایک گھر میں موجود ہے"

● اسی چیز کو اردو میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "اَحَدٌ" کا ترجمہ "کوئی ایک بھی" ہوگا جب کہ "وَاحِدٌ" کا ترجمہ صرف "ایک یا ایک ہی" ہو سکتا ہے۔ (اردو میں اس "ہی" اور "بھی" سے ہی اثبات اور نفی کا فرق ہے)

● "اَحَدٌ" مذکر مؤنث واحد جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ "واحد" اس طرح استعمال نہیں ہوتا مثلاً قرآن کریم میں ہے "لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ" (الاحزاب ۳۲) جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات (سب) کو کہا گیا ہے کہ تم عورتوں میں کسی ایک بھی جیسی نہیں ہو یعنی "كَوَاحِدَةٍ مِنَ النِّسَاءِ" یا

(تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو)۔ بلحاظ معنی یہاں 'اَحَدٌ' جمع مؤنث (النساء یعنی عورتوں) کے ساتھ آیا ہے۔ دوسری جگہ ہے 'مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ' (الاحزاب: ۴۰) یعنی 'محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی ایک کے بھی باپ نہیں ہیں' یہاں یہ 'اَبَا وَاحِدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ' کے معنوں میں ہے۔ یہاں 'احد' جمع مذکر کے ساتھ آیا ہے۔ گویا 'احد' ان دو آیتوں میں 'واحد' اور 'واحدۃ' دونوں کی جگہ آیا ہے۔

● لفظ 'احدٌ' اکیلا (مفرد) بھی استعمال ہوتا ہے مگر اس کا مؤنث 'اِحدیٰ' اکیلا استعمال نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ کسی عدد کے ساتھ یا کسی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے۔

● 'احدٌ' کبھی شیئ (چیز) کے معنی بھی دیتا ہے خصوصاً جب اس کے شروع میں 'من' لگا ہو، مثلاً 'ما فی الدار من احدٍ' کا مطلب ہوگا 'گھر میں عاقل یا غیر عاقل کوئی شے نہیں ہے'۔

● اس طرح یہاں (زیر مطالعہ عبارت میں) 'اَحَدُهُمْ' کے معنی ہیں 'ان میں سے کوئی ایک' مگر یہاں یہ کسی منفی جملے کے بعد نہیں آیا کہ اس کا ترجمہ 'کوئی ایک بھی' کیا جائے' بلکہ ایک مثبت جملے 'یَوَدُّ' کے ساتھ آیا ہے اور 'احد' بھی مضاف ہو کر آیا ہے۔ مفرد وہ صرف نفی کے ساتھ آتا ہے لہٰذا یہاں اس کا مفہوم ہے 'ان میں سے جس ایک کو بھی دیکھیں وہ یہی چاہتا ہے'۔ اس طرح یہاں 'اَحَدُهُمْ' کا ترجمہ بنے گا 'ان میں سے ہر ایک'۔ اور یوں اس پوری عبارت (یَوَدُّ اَحَدُهُمْ) کا ترجمہ بنے گا 'چاہتا ہے ان کا کوئی ایک بھی'۔ اسی کو بامحاورہ بنانے کے لیے ترجمہ کو 'ایک ایک چاہتا ہے ان میں سے' 'ان کا ہر ایک آرزو کرتا ہے' 'ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہے'، 'ان میں کا ایک ایک اس ہوس میں ہے' کی شکل دی گئی ہے۔ ایک مترجم نے '(مشرکوں) میں سے ایک کو تمنا ہے' کیا ہے۔ ممکن ہے کاتب نے غلطی سے 'ایک ایک' کی بجائے 'ایک' ہی لکھ دیا ہو۔ البتہ اس پر مزید بات 'الاعراب' میں ہوگی۔

۲:۵۹:۱(۴) [لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ]

اس عبارت میں تین الفاظ نئے ہیں۔ تفصیل یوں ہے:-

① 'لَوْ' یہاں 'کاش کہ' کے معنی میں ہے جو تمنا کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے اور فعل 'وَدَّ یَوَدُّ' کے لیے بطور مفعول آنے والے جملے کے شروع میں آتا ہے۔ 'لَوْ' کے مختلف استعمالات اور اُن کے مطابق اس کے اردو تراجم پر البقرہ: ۲۰ [۲:۱۵:۱(۷)] میں بات ہوئی تھی اور آگے 'الاعراب' میں بھی ہوگی۔

② 'یُعَمَّرُ' کا مادہ 'ع م ر' اور وزن 'یُفَعَّلُ' ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد 'عَمَرَ... یَعْمُرُ عِمَارۃً (نصر سے)

کے معنی ہیں ... کو آباد کرنا مثلاً کہتے ہیں "عمَرَ ارضَہ" (اس نے اپنی زمین آباد کی) یا "عمَرَ القومُ المکانَ" (لوگوں نے اس جگہ سکونت اختیار کی) اور اسی فعل کے معنی (عَمْرًا مصدر کے ساتھ) "... کو عمر دینا" بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "عمرَاللّٰہُ فلانًا" (اللہ نے فلاں کی زندگی دراز کی)۔ لفظ "عَمْر" میں بھی ایک طرح سے "بدن کی عمارت (آبادی) کی مدت" کا مفہوم موجود ہے۔ عربی میں یہ لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے "عُمُر" اور "عَمْر" دونوں کا مطلب عموماً "زندگی کی مدت" ہی ہے، تاہم عربی میں قسم کے موقع پر "عَمْر" استعمال ہوتا ہے جیسے "لَعَمْرُکَ" (تیری زندگی کی قسم)۔ یہ لفظ الحجر: ۷۲ میں استعمال ہوا ہے۔ عام استعمال (قسم کے علاوہ) "عُمُر" (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ جو قرآن کریم میں بھی سات جگہ آیا ہے۔

● فعل "عمَرَ یعمُر" بعض دفعہ بطور فعل لازم بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "عمَرَ الرجلُ عُمْرًا" کا مطلب ہے "اس آدمی نے (لمبی) عمر پائی"۔ اور "عمَرَ المنزلُ باَھلہ" کے معنی ہیں "منزل اپنے رہنے والوں سے آباد ہوگئی"۔ اور "عمرالمالُ یا عمُرالمالُ" (کرم سے) کے معنی ہیں "مال زیادہ ہوگیا"۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے ماضی مضارع کے صیغہ ہائے فعل کل چار جگہ آئے ہیں اور مزید فیہ کے ابواب تفعیل، افعال اور استفعال سے مختلف صیغہ ہائے فعل سات جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق کلمات (مثلاً عمر، معمور، معمّر، العمرۃ، عمارۃ، عمران وغیرہ) بھی ۱۶ جگہ وارد ہوئے ہیں ان پر اپنے اپنے موقع پر مزید بات ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "یُعَمَّرُ" اس مادہ سے باب تفعیل کے فعل مضارع مجہول کا صیغہ (واحد مذکر غائب) ہے۔ باب تفعیل سے اس کے فعل "عَمَّرَ ... یُعَمِّرُ تعمیرًا" کے معنی: "... کو لمبی عمر دینا" بھی ہوتے ہیں اور "... کو آباد کرنا" بھی۔ مثلاً کہتے ہیں "عَمَّرَاللّٰہُ فلانًا" (اللہ نے اسے لمبی عمر دی) اور "عمَّرَالمنزلَ اھلُھا یا عمَّرَالارضَ" کا مطلب ہے "گھر والوں نے منزل (گھر) کو آباد کیا" یا "اس نے زمین کو آباد کیا" یعنی اس پر مکان بنا کر سکونت اختیار کی۔ زیر مطالعہ لفظ کے بعد چونکہ ایک مدت کا ذکر ہے لہٰذا یہاں اس (یُعَمَّرُ) کا مطلب ہے "اس کو (لمبی) عمر دی جائے" ویسے تو "یُعَمَّرُ" کے معنی ہیں "لمبی عمر دیا جاتا ہے یا دیا جائے گا" مگر ابتدا میں "تمنا" کا حرف "لَو" آجانے کی وجہ سے ترجمہ "عمر دی جائے" کے ساتھ ہوگا۔

(۴) "اَلْفَ" کا مادہ "ا ل ف" اور وزن "فَعْلٌ" ہے (جو عبارت میں منصوب اور خفیف آیا ہے۔ وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) اس مادہ سے فعل مجرد "اَلَفَ ... یَاْلِفُ اَلْفًا" (ضرب سے) کے معنی ہیں: "... کو ایک ہزار دینا" اور "اَلِفَ ... یَاْلَفُ اَلْفًا و اِلافًا" (سمع سے) کے معنی ہوتے ہیں: "..... سے

محبت کرنا۔۔۔۔کے ساتھ انس اور الفت رکھنا۔ مانوس ہونا" اس سے اسم الفاعل "آلِفٌ" (محبت کرنے والا) اور صفت مشبہ "اَلِیفٌ" (یعنی بہت مانوس۔ دوست) استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں یہ فعل مجرد کسی طرح اور کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ مزید فیہ کے باب تفعیل سے فعل کے کچھ صیغے پانچ جگہ آئے ہیں اور بعض مشتق و ماخوذ کلمات (المؤلفۃ، ایلاف، الف، آلاف، الوف وغیرہ) سترہ جگہ آئے ہیں۔ ان پر حسب موقع بات ہوگی' ان شاء اللہ تعالیٰ

● زیر مطالعہ لفظ "اَلْفٌ" اسی مادہ سے ماخوذ ایک لفظ ہے۔ اور عربی میں اس سے مراد "ایک ہزار" ہوتا ہے یعنی یہ ایک اسم عدد ہے جس کے استعمال کے کچھ قواعد ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ اپنے معدود (تمیز) کی طرف مضاف ہوکر استعمال ہوتا ہے (اس لیے تخفیف استعمال ہوتا ہے) اور اس کا معدود (جسے تمیز کہتے ہیں) ہمیشہ واحد نکرہ اور مجرور آتا ہے۔ اگر گنتی میں الف کی جمع آئے (مثلاً تین ہزار، دس ہزار وغیرہ) تو لفظ "آلاف" استعمال ہوتا ہے اور اگر بغیر مقرر گنتی کے "ہزاروں" کہنا ہو تو پھر اس کی جمع "اُلوف" استعمال ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں لفظ "الف" دس جگہ آیا ہے اور اس کا تثنیہ (اَلفین کی صورت میں) صرف ایک جگہ جمع "آلاف" دو جگہ اور دوسری جمع (الوف) بھی صرف ایک ہی جگہ آئی ہے۔

(۴) "سَنَةٍ" کا مادہ "س ن ہ" بھی ہوسکتا اور "س ن و" بھی۔ اکثر کتب لغت میں اسے ان دونوں مادوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور صاحب القاموس نے "س ن و" کو ترجیح دی ہے (اگرچہ بیان دونوں جگہ کیا ہے) اس کا اصلی وزن "فَعَلَۃٌ" ہے۔ اصلی شکل یا تو "سَنَہَۃٌ" تھی یا "سَنَوَۃٌ"۔ پھر خلاف قیاس لام کلمہ والی "ہ" یا "و" کو حذف کر دیا گیا جس طرح "شَفَہَۃٌ/شَفَوَۃٌ" سے "شَفَۃٌ" (ہونٹ) بنا ہے

● "س ن ہ" مادہ سے فعل مجرد "سَنِہَ یَسْنَہُ سَنَہًا" (سمع سے) کے معنی ہیں "بدبودار ہونا، ذائقہ اور بو بدل جانا" زیادہ تر اس کا استعمال کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "سَنِہَ الطعامُ اوِالشرابُ" (کھانا یا مشروب بدبودار ہوگیا) اور اس کا مطلب "کسی چیز پر کئی برس گزر جانا" بھی ہوتا ہے اور ان ہی معانی کے لیے یہ مزید فیہ کے باب مفاعلہ اور تفعل سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں بھی اس کے باب تفعل سے ایک صیغہ فعل ایک جگہ آیا ہے

● اور "س ن و" مادہ سے فعل مجرد "سنا یَسْنُو (سَنُو یَسْنُو) سَنُوًا" (نصر سے) کے معنی ہیں "چمکنا، روشن اور بلند ہونا" زیادہ تر اس کے ساتھ "البرق" (بجلی) یا "النار" (آگ) فاعل ہوکر استعمال ہوتے ہیں یعنی "سنا البرقُ او النارُ" (بجلی یا آگ کی روشنی نمودار ہوئی) تاہم یہ بعض دوسرے معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "سَنَا البابَ" (اس نے دروازہ کھول دیا) یا "سَنَا الدَلوَ" (اس نے ڈول کھینچ کر (کنوئیں سے) باہر نکالا)

گویا یہ لازم ومتعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ ان معنوں کے لیے یہ "یائی اللام" (س ن ی) مادہ سے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "سَنَى (يَسْنِي سَنْيًا) البابَ" (ضرب سے) کے معنی بھی "دروازہ کھولا" ہی ہوتے ہیں اور "سَنِيَ يَسْنَى سَنَاءً" (سمع سے) کے معنی "بلند (مرتبت) ہونا" بھی ہوتے ہیں اور اس (یائی) مادہ سے بھی باب تفعل میں فعل "تَسَنَّى" کے معنی بھی "بدل جانا" (ذائقہ یا بُو) ہوتے ہیں۔ گویا اس لحاظ سے فعل "تَسَنَّهَ" اور "تَسَنَّى" کا مطلب ایک ہی ہے۔

● قرآن کریم میں ان مادوں (سنو، سنہ یا سنی) سے کسی قسم کا فعل مجرد کہیں استعمال نہیں ہوا اور مزید فیہ سے بھی صرف باب تفعل کا ایک ہی صیغہ صرف ایک جگہ (البقرہ: ۲۵۹) میں آیا ہے جو (جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے) "تسنہ" سے بھی ہو سکتا ہے اور "تسنی" سے بھی۔ (اس پر مزید بات حسب موقع ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ)۔ ان مادوں سے ماخوذ الفاظ (سنا، سنۃ اور سنین) قرآن کریم میں بیس جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "سَنَة" بھی "سنو" یا "سنہ" سے بنا ہے۔ اس کا مطلب ہے "ایک سال" اور بعض دفعہ اس سے مراد "قحط والا سال" لیا جاتا ہے۔ لفظ "سنۃ" کی جمع "سَنَهات، سنوات اور سِنُون" آتی ہے۔ ان میں سے قرآن کریم میں صرف آخری جمع سالم مذکر مجرور یا منصوب صورت میں (سِنِين) بکثرت استعمال ہوئی ہے جو مطلق برسوں کے علاوہ "قحط والے برسوں" کے لیے بھی آیا ہے۔ باقی دو جمعیں قرآن میں نہیں آئیں۔

● اس طرح (مفردات کی اس وضاحت کی بناء پر) اس پوری عبارت (لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ) کا ترجمہ ہوا "کاش کہ اس کو (لمبی) عمر دی جائے ایک ہزار سال" — اسی کو بامحاورہ کرنے کے لیے "کہ عمر پاوے ایک ہزار برس / کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جاوے / اسے کاش اس کی عمر ہزار برس ہو / کہ کہیں ہزار برس جیے / کاش جیتا رہے ہزار برس / کاش وہ ہزار برس جیتا رہے / کہ ہزار (ہزار) برس کی عمر پائے" کی صورت دی گئی ہے۔ اس میں محاورے ہی کی وجہ سے بہت سے حضرات نے "لَوْ" (کاش کہ) کا ترجمہ نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اردو کا فعل اس مفہوم کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی طرح "يُعَمَّرُ" کے فعل مجہول ہونے کو بھی تراجم میں ظاہر نہیں کیا گیا کیونکہ "عمر پانا" میں "عمر دیے جانا" کا مفہوم آ جاتا ہے۔ اور "جینا" یا "جیتے رہنا" یا "عمر کا ہو جانا" بھی بلحاظ مفہوم درست ہیں، اگرچہ اصل لفظ (ن ع م ر) سے ذرا ہٹ کر ہیں۔

عبارت میں نیا وضاحت طلب لفظ "بِمُزَحْزِحِهٖ" ہے بلکہ اس کی ابتدائی "با (ب) کا تو کوئی
ترجمہ نہیں ہوگا، کیونکہ یہ وہ "با (ب) ہے جو "مَا" الحجازیۃ (نافیہ) کی خبر پر آتی ہے۔ دیکھیے
[۲:۲:۱ (۵)] میں — اور آخری ضمیر مجرور (ہ بھی یہاں بمعنی "اس کو" ہے۔ باقی کلمات بھی
پہلے گزر چکے ہیں، ان کا صرف ترجمہ لکھ دینا کافی ہے مثلاً "وَ" (اور یا "حالانکہ) [دیکھیے ۱:۴:۱ (۳)]۔
"مَا" (نہیں ہے) الحجازیہ کا حوالہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ "هُوَ" (وہ) معروف ضمیر ہے۔ "مِن" (سے
کی وضاحت چاہیں تو [۲:۲:۱ (۵)] میں دیکھ لیجئے۔ "العذاب" (سخت سزا۔ عذاب) کی لغوی
تشریح البقرہ: ۷، [۲:۶:۱ (۶)] میں گزر چکی ہے اور "اَن" (یہ کہ) یا صرف "کہ" پر [۲:۱۹:۱ (۲)]
میں بات ہوئی تھی اور آخری لفظ "یُعَمَّرَ" پر تو ابھی اسی قطعہ میں اوپر [۲:۵۹:۱ (۴)] میں بات

ہوئی ہے۔ ہوئی ہے۔
● اس طرح نیا لفظ یہاں "مُزَحْزِحٌ" ہے (جو عبارت میں مجرور اور خفیف آیا ہے، اس کی وجہ
"الاعراب" میں بیان ہوگی)۔ یہ رباعی (چار حرفی مادہ "ز ح ز ح" سے ہے۔ بلکہ دراصل تو اس کا تعلق
ثلاثی مادہ "ز ح ح" سے ہے کیونکہ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "زَحَّ ... یَزُحُّ زَحًّا" (نصر سے) کے
معنی "... کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا" ہوتے ہیں اور رباعی فعل "زَحْزَحَ ... یُزَحْزِحُ زَحْزَحَۃً" کے معنی
بھی "... کو دور کر دینا / ... کو پرے سرکا دینا" ہوتا ہے۔ اور جس چیز سے دور کر دیا جائے اس پر "عَن"
کا صلہ بھی لگتا ہے اور "مِن" بھی، اور قرآن کریم میں اس کے ساتھ دونوں صلوں کا استعمال آیا ہے —
قرآن کریم میں اس فعل سے ماضی مجہول کا ایک صیغہ صرف ایک جگہ (آل عمران: ۱۸۵) آیا ہے
● زیر مطالعہ لفظ "مُزَحْزِحٌ" اس فعل سے صیغہ اسم الفاعل ہے اور اس کا مطلب (ترجمہ) ہے
"دور کر دینے والا / سرکا دینے والا" جس کا بامحاورہ ترجمہ بعض نے "بچانے والا / نجات دینے والا" سے
سے کیا ہے اور بعض نے اس کا ترجمہ صیغہ فعل "یُزَحْزِحُ" (چھڑا سکنا۔ بچا سکنا، دور کرنا وغیرہ)

ہی کر لیا ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوگا۔
● اس طرح اس زیر مطالعہ عبارت "وماھو بمزحزحہ من العذاب ان یعمر" کا لفظی ترجمہ بنا "حالانکہ
نہیں ہے وہ دور کرنے والا اس (آدمی) کو عذاب سے کہ اس کو لمبی عمر دی جائے"۔ اس پر مزید بات تو
"الاعراب" میں آئے گی، سر دست اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہاں "ھو" (وہ) اور "اَن یُعَمَّرَ" (کہ وہ
زیادہ عمر پائے) ایک دوسرے کے لیے ہی آئے ہیں اور عبارت کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "وہ چیز
یعنی زیادہ عمر پانا اس (آدمی) کو عذاب سے دور کر دینے والا نہیں ہے / ہوگا"۔ اس مفہوم کو ظاہر کرنے

کے لیے مترجمین نے مندرجہ بالا لفظی ترجمہ کو با محاورہ کرنے کے لیے کس کس طرح ترجمہ کیا ہے اس کا اندازہ تراجم کے درج ذیل تقابلی مطالعہ سے ہوگا جس سے آپ یہ بھی دیکھ سکیں گے کہ کون با محاورہ اور لفظی ترجمہ دونوں کا توازن برقرار رکھ سکا ہے اور کون محاورہ یا مفہوم کی وضاحت کے لیے اصل الفاظ سے کتنا دور گیا ہے، کیونکہ بلحاظ مفہوم تو یہ سب تراجم درست ہی ہیں مثلاً:۔

● "نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے اس قدر جینا / نہیں اس کو نجات دینے والا عذاب سے اس قدر جینا / اتنی عمر پانا / اتنی عمر دیا جانا" اس میں "مُزَحْزِحِ" کا لفظی ترجمہ "دور ہٹانے والا" کی بجائے "بچانے والا" یا "نجات دینے والا" کیا گیا ہے۔ ان معنی کے لیے الگ عربی لفظ (مثلاً وَقَى یَقِی یا نجی یُنجی سے اسم الفاعل) آتے ہیں مگر یہاں محاورے کی بنا پر یہ ترجمہ اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں فعل مجہول کے صیغہ مضارع کی بجائے مصدری صورت میں ترجمہ "عمر دیا جانا" (یا جینا یا عمر پانا) سے کیا گیا ہے۔ اس "عمر دیا جانا" میں مجہول فعل کا مفہوم موجود ہے اور مصدر کے ساتھ ترجمہ کرنے کی وجہ یہاں "اَنْ" کا استعمال ہے ["اَنْ" کے مصدری استعمال کے لیے دیکھئے البقرہ: ۲۶ [۲:۱۹:۱(۲)]

● بہت سے مترجمین نے "مُزَحْزِحٌ" (اسم الفاعل) کا ترجمہ فعل مضارع "یُزَحْزِحُ" کی طرح کر دیا ہے، مثلاً "اور کچھ اس کو سرکا نہ دے گا عذاب سے اتنا جینا / اس قدر جینا" "وہ اسے عذاب سے دُور نہ کرے گا اتنی عمر دیا جانا" یا "حالانکہ اتنی عمر پانا (بھی) اس کو عذاب سے نہیں چھڑا سکتا"۔ ان ترجموں (اتنی عمر، اس قدر جینا) میں "اتنی" اور "اس قدر" سے اشارہ ہزار برس جینے کی تمنا کی طرف ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ ورنہ اصل عربی عبارت میں اس "اتنی" اور "اس قدر" کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی ہزار برس کی عمر کی تمنا کو سامنے رکھتے ہوئے بعض نے "اَنْ یُّعَمَّرَ" کا ترجمہ "اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے" اور "اتنی عمر وہ پا بھی جائے" (تو یہ اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی / تو نہیں بچا سکتی) کی صورت میں کیا ہے۔ یہ اسم الفاعل کا ترجمہ فعل کے صیغے کی طرح کرنا اردو محاورے کی مجبوری ہے۔ اسی طرح "مل بھی جائے اور پا بھی لے" میں "بھی" کا استعمال بھی اردو محاورے کے لیے ہی ہے۔ بعض نے ابتدائی "ھُوَ" کا ترجمہ "یہ امر" سے کیا ہے، یعنی "یہ امر عذاب سے تو نہیں بچا سکتا کہ (کسی کی) بڑی عمر ہو جاوے"۔ یہاں بھی "عمر لمبی دیا جائے" کی بجائے "بڑی عمر ہو جاوے" سے ترجمہ اردو محاورے کے لحاظ سے ہی درست ہے۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے "حالانکہ اتنی مدت جیتا بھی رہے تو بھی یہ درازی عمر اس کو عذاب سے نجات دینے والی نہیں"، جو مفہوم کے اعتبار سے تو عمدہ ہے مگر اصل الفاظ سے بہت دور ہو گیا ہے۔

اس کی بجائے اوپر یہی مفہوم رکھنے والے مختصر تراجم پر نظر ڈال لیجئے (مثلاً "اتنی عمر پانا بھی اس کو عذاب سے نہیں چھڑا سکتا" ان تراجم میں "بچا سکتا۔ چھڑا سکتا" وغیرہ میں "یہ سکنا" کا اضافہ بھی اردو محاورے کے مطابق نفی کے زور کو ظاہر کرنے کے لیے کرنا پڑا ہے۔

۲:۵۹:۱(۶) [وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ]

اس عبارت میں بلحاظ اصل تو کوئی لفظ بھی نیا نہیں، البتہ بلحاظ استعمال اور ساخت بعض کلمات کی وضاحت کی ضرورت ہوگی۔

① "وَاللّٰهُ" میں "وَ" استیناف کی ہے، یعنی یہاں سے ایک الگ مضمون شروع ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے سابقہ عبارت کے آخر پر وقف مطلق کی علامت (ط) ڈالی جاتی ہے۔ اب اس "وَ" کا اردو ترجمہ تو "اور" ہی کیا جاتا ہے مگر مفہوم اس میں "اور یہ بات بھی قابل ذکر یا قابل غور ہے کہ" کا ہوتا ہے۔

② "بَصِيْرٌ" کے معنی ہیں "خوب دیکھنے والا۔ ہر وقت دیکھنے والا"۔ کیونکہ یہ صفت مشبہ ہے۔ اس کا مادہ "ب ص ر" اور وزن "فَعِيْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (بصر اور بصُر) کے معنی (دیکھنا۔ دیکھ لینا) اور اس کے ساتھ "با" (ب) کے صلہ کے استعمال پر (یعنی "بصِرَ به اور بصُرَ به" کے معنی پر) مفصل بات البقرہ: ۷ [۲:۶:۱(۴)] میں کلمہ "ابصار" کے ضمن میں گزری تھی۔ اور پھر البقرہ ۱۷ [۲:۱۲:۱(۱۱)] میں بھی کچھ بات ہوئی تھی۔

③ "بِمَا" (اس کو جو کہ)۔ اس کی "با" (ب) تو وہی ہے جو فعل "بصُر به" میں مفعول سے پہلے بطور صلہ آتی ہے اور "مَا" موصولہ ہے۔ فعل کے ساتھ اگر کوئی صلہ استعمال ہوتا ہو تو وہ صلہ اس فعل سے بننے والی صفت مشبہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی یہاں "بصیر بما" ایک طرح سے "یبصُر بما" کے برابر ہے۔ البتہ فعل کی بجائے صفت مشبہ کے استعمال میں دوام و استمرار اور قدرے مبالغہ کا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً "یبصُر بما" کا ترجمہ ہوتا "وہ دیکھ لیتا ہے اسے جو" مگر اب "بصیر بما" کا ترجمہ ہوگا "وہ خوب اچھی طرح اور ہر وقت دیکھنے والا (یعنی دیکھتا رہتا) ہے اس کو جو کہ"

④ "يَعْمَلُوْنَ" کے فعل "عمِل يَعْمَل عَمَلاً" (کام کرنا۔ عمل کرنا) کے مادہ (ع م ل) اور باب وغیرہ کے استعمال) پر البقرہ: ۲۵ [۲:۱۸:۱(۲)] میں بات ہوئی تھی "يَعْمَلُوْنَ" کا ترجمہ ہوگا "وہ عمل کرتے ہیں، وہ کام کرتے ہیں"۔

● اس طرح زیر مطالعہ جملے (واللہ بصیر بما یعملون) کا لفظی ترجمہ ہوگا "اللہ تعالیٰ خوب ہر وقت

دیکھنے والا ہے اس کو جو عمل وہ کرتے ہیں؛ یہاں بھی اردو محاورے کے لیے تقریباً تمام مترجمین نے "بصیر" کا ترجمہ صفت مشبہ کی طرح کرنے کی بجائے صیغۂ فعل "یبصر" کی طرح کر دیا ہے یعنی "اللہ دیکھتا ہے" کی صورت میں۔ البتہ بیشتر حضرات نے صفت مشبہ کے استمرار اور دوام کے مفہوم کو "دیکھ رہا ہے" کی صورت میں ظاہر کیا ہے، بلکہ بعض نے اسی لیے "خوب دیکھ رہا ہے" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "حق تعالیٰ کے پیش نظر ہیں" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ اس "پیش نظر" میں (ہر وقت نظر کے سامنے رہنا) کا مفہوم موجود ہے۔ اسی طرح "بما یعملون" (جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو) کا ترجمہ بھی بعض نے تو "جو کچھ / جو وہ کرتے ہیں' جو کام وہ کرتے ہیں" سے ہی کیا ہے۔ بعض نے اس میں بھی "کر رہے ہیں" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ یعنی ان کے ہر وقت کے عمل۔ بعض نے "بما یعملون" کی "مَا" کو مصدریہ سمجھ کر ("مَا" کے مصدریہ استعمال کے لیے دیکھئے البقرہ: ۷۵ [۲:۴۷:۱(۵)]) ترجمہ "ان کے کام' ان کے کوتک (کرتوت)" کے ساتھ کیا ہے۔ کیونکہ بلحاظ مفہوم یہاں دراصل ان کے "بُرے اعمال" ہی مراد ہے' اگرچہ "مَا" میں تو تمام اعمال (اچھے بُرے سب ہی) آجاتے ہیں۔

۲:۵۹:۲ الاعراب

"حصۂ اللغۃ" کی طرح نحوی ترکیب کے لحاظ سے بھی اس قطعہ کو (جو ایک ہی آیت پر مشتمل ہے) چار جملوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک حصہ (مرکب جاری) ایسا بھی ہے جو بلحاظ اعراب اپنے سے ماقبل جملے کا حصہ بھی بن سکتا ہے اور اپنے سے مابعد کا بھی۔ جس کی وجہ سے ترجمہ میں بھی فرق ہوگا۔ بہر حال اعراب کی تفصیل یوں ہے:

① ولتجدنهم احرص الناس علی حیوة

[وَ] عاطفہ ہے اور [لتجدنهم] کا ابتدائی حصہ (لتجدنّ) فعل مضارع مؤکد بلام و نون ثقیلہ ہے۔ یہ لام مفتوحہ (لَ) تاکید کے لیے آتا ہے (یعنی "ضرور ہی") اور بعض نحوی اس سے پہلے ایک قَسَم (مثلاً واللّٰہِ = بخدا) محذوف سمجھتے ہیں جس کے جواب پر یہ (لام تاکید) لگتا ہے۔ (خیال رہے کہ فعل مضارع ـــــ بلکہ امر اور نہی بھی ـــــ اس لام کے بغیر صرف آخر پر نون ثقیلہ (نّ) یا خفیفہ (نْ) لگانے سے بھی مؤکد ہو سکتے ہیں) "لتجدنّ" کے بعد ضمیر منصوب "ھم" اس فعل (وجد یجد) کا مفعول اوّل ہے۔ اس کے بعد [احرص النّاس] کا ابتدائی کلمہ "اَحْرَصَ" (جو صیغۂ افعل

التفضیل ہے) اس فعل (لتجدنّ) کا دوسرا مفعول (لہٰذا منصوب) ہے اور "سب کے مقابلے میں" کے مفہوم کے لیے یہ "الناس" کی طرف مضاف ہے (اسی لیے "الناس" مجرور (بالاضافہ) ہے) یعنی سب لوگوں سے زیادہ حریص" [علی حیوۃ] کا "علی" حرف الجر ہے جو فعل "حَرَص یحرِص" کے مفعول پر بطور صلہ لگتا ہے۔ گویا "احرص" یہاں "یحرصون علی..." کے مفہوم میں ہے "حیوۃ" مجرور بالجر ہے اور یہ مرکب جاری (علی حیوۃ) "احرص" سے متعلق ہیں۔ یعنی اس کے معنی میں شامل "فعل" (یحرصون) سے متعلق ہیں۔ یہاں لفظ "حیوۃ" کو نکرہ (بجائے "الحیوۃ") لانے کی ایک دلچسپ توجیہ بلحاظ بلاغت یوں بیان کی گئی ہے کہ انسان ساری زندگی کا حریص نہیں ہوتا، جو گزر چکی وہ تو گزر چکی۔ دراصل وہ بقایا یعنی مستقبل کی زندگی کا حریص ہوتا ہے جو زندگی کا کچھ حصہ ہے اس لیے یہاں لفظ "حیاۃ" نکرہ لایا گیا ہے یعنی "کچھ زندگی" پر حریص۔ ویسے نکرہ چونکہ تعظیم اور تحقیر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے یہاں "حیاۃ" بمعنی "معمولی زندگی، حقیر زندگی" بھی لیا جاسکتا ہے۔

(۲) ومِنَ الذین اشرکوا

[وَ] عاطفہ اور [مِنْ] حرف الجر ہے [الذین] اسم موصول ہے جو یہاں بوجہ "مِنْ" مجرور ہے اگرچہ مبنی ہونے کے باعث کوئی اعرابی علامت اس میں ظاہر نہیں ہوتی۔ [اَشرکوا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے اور اپنی ضمیر فاعلین (ھم) سمیت جملہ فعلیہ ہوکر "الذین" کا صلہ ہے۔ اور یہ سارا مرکب جاری (من الذین اشرکوا) بلحاظ ترکیب نحوی مندرجہ بالا جملہ (۱) پر عطف (بذریعہ واو العطف جو اس کے شروع میں ہے) قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں یہاں "مِنْ" صیغہ افعل التفضیل کے دو (آدمیوں یا چیزوں یا گروہوں وغیرہ) کے باہم مقابلہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے پہلے "احرص" محذوف ہے، یعنی اصلی عبارت "واحرصَ من الذین اشرکوا" بنتی ہے، یعنی مشرکوں سے بھی بڑھ کر حریص (زندگی پر پائے گا)۔ چونکہ "الناس" (احرص الناس والا) یعنی "سب لوگوں" میں عموم ہے کہ اس میں تو کافر مسلم سب شامل ہیں، اس عموم کے بعد "مشرکین" کی تخصیص (یعنی مشرکوں سے بھی بڑھ کر) لانے کی وجہ سے "احرص" کی تکرار حذف کر دی گئی ہے اور اس تخصیص میں یہ مفہوم موجود ہے کہ "مشرکین عرب" تو مرنے کے بعد کسی زندگی کے قائل ہی نہیں تھے اور نہ ہی وہ آخرت اور اس کے حساب کتاب کو مانتے تھے، ان کے نزدیک تو جو کچھ

ہے وہ یہی "دنیا کی زندگی" ہے۔ اس لیے وہ اگر اسی زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ ان کا یہ غلط عقیدہ ہو سکتا ہے، مگر تعجب تو ان اہل کتاب پر ہے (جن کا ذکر ان آیات میں چل رہا ہے) جو اللہ اور آخرت پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور پھر دنیوی زندگی اور اس کے مفادات وغیرہ پر مشرکوں (اور آخرت کے منکروں) سے بھی بڑھ کر فریفتہ اور شیدا بنے ہوئے ہیں (آیت میں یقیناً ہم دنیا پرست قسم کے مسلمانوں کے لیے بھی مقام غور وفکر ہے)۔

● ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس عبارت (وَمن الذین اشرکوا) کا تعلق مابعد والے جملے (۳ جو آگے آرہا ہے) سے بھی بنتا ہے۔ اس صورت میں ابتدائی "وَ" عطف کی نہیں بلکہ استیناف کی ہے۔ اور یہاں سے ایک الگ جملہ شروع ہوتا ہے اس صورت میں "مِنْ" یہاں تبعیضیہ (بعض میں سے) ہے اور اس عبارت کے بعد ایک نکرہ موصوفہ یا اسم موصول محذوف ہے۔ گویا عبارت "ومن الذین اشرکوا قَوْمٌ ....." یا "الذین ....." بنتی ہے (یعنی مشرکوں میں سے کچھ لوگ یا وہ بھی ہیں جو)

● اس دو طرفہ نحوی تعلق کی بناء پر ہی اس عبارت (ومن الذین اشرکوا) سے پہلے اور بعد میں (دونوں طرف) علامت معانقہ (∴) مع وقف جائز (ج) ڈالی جاتی ہے کہ اسے سابقہ جملے (۱) کا حصہ سمجھ کر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور مابعد جملے (۳) کے ساتھ ملا کر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اردو کے بیشتر مترجمین نے پہلی ترکیب کے ساتھ (یعنی من الذین اشرکوا کو سابقہ جملہ ۱ کا حصہ سمجھ کر) ہی ترجمہ کیا ہے یعنی "مشرکوں سے بھی بڑھ کر / زیادہ" کی صورت میں۔ صرف ایک دو مترجمین نے دوسری ترکیب کے ساتھ (یعنی مشرکوں میں سے ایک کو تمنا ہے) ترجمہ کیا ہے۔ اعراب القرآن کی کتابوں (مثلاً عکبری کی التبیان اور ابن الانباری کی "البیان" وغیرہ) میں پہلی ترکیب کو "اوجہ الوجھین" (یعنی دونوں میں سے زیادہ معقول) قرار دیا گیا ہے اور بعض (مثلاً الدرویش کی اعراب القرآن) میں تو دوسری ترکیب کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

۳ یودّ احدھم لو یُعمّر الف سَنَةٍ

یہ اپنی جگہ ایک مکمل جملہ ہے جس کا تعلق جملہ ۱ (مندرجہ بالا) سے بھی ہو سکتا ہے اور اس کی ابتداء کا ایک حصہ گزشتہ عبارت (ومن الذین اشرکوا) بھی سمجھی جا سکتی ہے یعنی [یَوَدُّ] تو فعل مضارع ہے اور اس کا فاعل [احدُھم] ہے جو مرکب اضافی ہے (اصل فاعل تو "اَحَدُ" ہی ہے جو مضاف خفیف اور مرفوع ہے)۔

● پھر یہ عبارت (یود احدھم) "لتجدنھم" کی ضمیر مفعول (ھم) کا حال بھی ہو سکتی ہے یعنی "تو ان لوگوں کو سب لوگوں سے بڑھ کر زندگی کے حریص پائے گا بلکہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر حریص اس حالت میں کہ ان میں کا ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ۔۔" یعنی مقدر عبارت کچھ یوں بنے گی: ولتجدنھم احرص الناس واداً (ای مُتَمَنِّیًا) احدُھمْ (یعنی ہر ایک کو گرفتارِ آرزو پاؤگے۔ یا ان میں سے ہر ایک کو اس حالت میں پاؤگے کہ۔ یود۔۔۔۔۔)

● اور اسی عبارت (یود احدھم) کو "من الذین اشرکوا" کے محذوف مبتدأ مؤخر (مثلاً قَوْمٌ) کی صفت قرار دیں تو یہ جملہ مستانفہ "یود احدھم" سے نہیں بلکہ "ومن الذین اشرکوا" سے شروع سمجھا جا سکتا ہے، جیسا کہ اوپر (۲ میں) بیان ہوا ہے۔

● [لَوْ] حرف تمنی ہے اور نحوی حضرات اسے "ان" (ناصبہ یعنی "کہ") کے معنوں میں لیتے ہیں اگرچہ یہ نصب نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل "وَدَّ یَوَدُّ" کے بعد یا تو "لَوْ" آتا ہے یا پھر اس کی بجائے "اَن" استعمال ہوتا ہے اس لیے گویا "لَوْ" بمعنی "اَنْ" (کہ) استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں دونوں استعمالات کی مثالیں موجود ہیں مثلاً "ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ" (البقرہ: ۲۶۶) اور "یودُّ" کے بعد "لَوْ" کے استعمال کی مثال تو زیر مطالعہ آیت ہی ہے۔ اور اسی (اَنْ) والے مفہوم کی بنا پر "لَوْ" کو مصدریہ بھی کہتے ہیں اور اس کا یہ استعمال فعل "وَدَّ یَوَدُّ" کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے یہاں "لَوْ" کے بعد [یُعَمَّرُ] ہے۔ فعل مضارع مجہول مع ضمیر نائب الفاعل (ھو) ہے۔ اسے مصدر مؤول کے معنی میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبارت "یود احدھم تعمیر (یعنی ان یعمّر۔۔۔) کے معنی میں ہے، یعنی ان میں کا ایک ایک۔۔۔۔۔ "عمر پانا" (عمر دیا جانا) چاہتا ہے۔ یعنی "لَوْ" سے شروع ہونے والی عبارت فعل "وَدَّ یَوَدُّ" کا مفعول لہٰذا محلاً منصوب ہے [الفَ سنۃٍ] مرکب عددی ہے جس کا ابتدائی حصہ "الفَ" یہاں ظرف (زمان) ہونے کے باعث منصوب ہے (اور آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بھی ہے)، اور اسے مفعول فیہ بھی کہتے ہیں۔ اور لفظ "سنۃٍ" اس عدد (الف) کی تمیز (یا معدود) ہے، جو ہمیشہ واحد نکرہ مجرور ہوتی ہے "سنۃٍ" کی جر کی یہی وجہ ہے۔ یہاں "ایک ہزار سال" کی عمر سے مراد مطلقاً بہت لمبی عمر ہو سکتی ہے، ہزار کی مخصوص گنتی ضروری نہیں۔

(۴) وماھو بمزحزحہ من العذاب ان یُعَمَّرَ

[وَ] حالیہ (بمعنی "حالانکہ") ہے اور "ما" نافیہ حجازیہ ہے (جس کی خبر پر "بِ" آتی ہے یا خبر منصوب

ہوتی ہے) اور [هُوَ] ضمیر مرفوع اس (مَا) کا اسم ہے [بمزحزحه] کی "بِ" زائدہ ہے (جو "ما" کی خبر پر آتی ہے اس کا الگ ترجمہ نہیں کیا جا سکتا) اور "مزحزحه" (مضاف مضاف الیہ مل کر جس کی ضمیر مجرور اسی "هُوَ" (اسم مَا) کے لیے ہے "ما" کی خبر لہٰذا محلاً منصوب ہے (اگرچہ "بِ" کی وجہ سے لفظاً مجرور ہو گئی ہے)

[من العذاب] جار مجرور "مزَحْزِحهٖ" (کے معنیٰ فعل) سے متعلق ہے [ان يُعَمَّر] "اَن" ناصبہ مصدریہ ہے، اس لیے "يُعَمَّرَ" مضارع (مجہول صیغہ واحد مذکر غائب) منصوب ہو گیا ہے، علامت نصب "رَ" کی فتحہ ہے۔ اور مصدریہ ہونے کے باعث "اَن يُعَمَّرَ" کو مصدر مؤول "تعميرُهٗ" کے ہم معنیٰ سمجھا جا سکتا ہے اور یہ (تعميرُهٗ یا "ان يُعَمَّرَ") "مزحزحه" کے معنیٰ فعل (یعنی "يُزَحْزِحه" کے مفہوم میں۔ کیونکہ "مزَحزِح" اسم الفاعل ہے جو فعل کا سا عمل کرتا ہے) کا فاعل لہٰذا محلاً مرفوع ہے۔ یعنی "وماهو (اَن) يُزحزحه من العذاب تعميرُه" (وہ (ایسا) نہیں کہ ہٹا دے اس کو عذاب سے اس کا عمر پانا)

● یہاں ضمیر منفصل "هو" کی (بلحاظ مرجع) دو صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ یہ "احدهم" کے لیے ہے۔ اس صورت میں جملے کی ترکیب وہی بنتی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے یعنی عبارت یوں بنتی ہے۔ "وماذلك المتمنى بمزحزحه"..... اور ترجمہ یہ ہوا کہ "وہ (تمنا کرنے والا) ایسا نہیں کہ ہٹا دینے والا ہو اس کو عذاب سے یہ کہ وہ عمر پا لے" (یعنی وہ صاحبِ تمنا ایسا نہیں کہ لمبی عمر پانا اس کو عذاب سے ہٹا لے) دوسری صورت اس ضمیر (هو) کی یہ ہو سکتی ہے کہ وہ "ان يُعَمَّرَ" ہی کے لیے ہے یعنی "ان يُعَمَّرَ" اسی ضمیر کا بدل یعنی "ما" کا اسم ہو کر محلاً رفع میں ہے (سابقہ ترکیب میں وہ فاعل ہو کر محل رفع میں تھا) گویا عبارت (مقدر) کچھ یوں بنتی ہے "وماهو اى ان يُعَمَّرَ بمزحزحه من العذاب یا "وما التعميرُ" (مصدر مؤول) بمزحزحه من العذاب: یعنی "نہیں ہے وہ (امر) یعنی اس کا لمبی عمر پانا، ایسا کہ ہٹا دینے والا ہو اس کو عذاب سے:

● دونوں صورتوں میں عذاب سے ہٹانے کا فاعل "ان يعمر" (عمر پانا) ہے اس لیے ترجمہ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ حصۂ "اللغۃ" میں یہ دوسرا (بدل والا) ترجمہ کیا گیا تھا۔ اکثر مترجمین نے اسی کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے۔ اور اسی لیے "ان يعمر" کا ترجمہ پہلے کر دیا گیا ہے کہ وہ "فاعل" یا اسم "ما" ہے

(۵) والله بصير بما يعملون

[وَ] مستانفہ ہے [اللهُ] مبتدأ مرفوع ہے اور [بصير] اس کی خبر مرفوع ہے [بما يعملون] "بِ" حرف الجر یہاں صلۂ فعل کے طور پر آیا ہے (یعنی يبصر ب.... کے معنی ہیں)، "ما" موصولہ ہے

اور "یعملون" فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے اور یہ جملہ فعلیہ "یعملون" (جو دراصل "یعملونہ" تھا یعنی اس میں "ما" موصولہ کی ضمیر عائد محذوف ہے) "ما" کا صلہ ہے اور یوں یہ سارا مرکب جاری (بما یعملون) متعلق خبر (بصیر) ہے۔ اس کے ترجمہ میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ ورنہ حصہ اللغۃ دیکھ لیں

۲:۵۹:۳ الرسم

اس پوری عبارت میں بلحاظ "رسم" صرف ایک لفظ "حیوۃ" قابل ذکر ہے۔ باقی تمام کلمات کا رسم املائی اور رسم قرآنی یکساں ہے۔

● لفظ "حیوۃ" کے رسم پر اس سے پہلے البقرہ:۸۵ [۲:۵۲:۳] میں بات ہوئی تھی بلکہ اس سے پہلے البقرہ:۳ [۲:۲:۳] میں لفظ "الصلوٰۃ" کے ضمن میں وہ آٹھ کلمات بیان ہوئے تھے جو قرآن مجید میں الف کی بجائے "و" سے لکھے جاتے ہیں (یعنی ان میں "و" کو ہی بصورت الف پڑھا جاتا ہے) بشرطیکہ یہ کسی ضمیر کی طرف مضاف نہ ہوں۔ ان آٹھ حروف میں سے ایک یہ "حیوۃ" یا "الحیوۃ" بھی ہے۔ اگر یہ کسی ضمیر کی طرف مضاف ہوں تو "الف" کے ساتھ ہی لکھا جائے گا جیسے "حیاتی" "حیاتنا" وغیرہ میں ہے۔ آپ کی آسانی کے لیے وہ آٹھ کلمات یہاں دوبارہ لکھے جاتے ہیں: الصلوٰۃ۔ الزکوٰۃ۔ الحیوٰۃ۔ الغدوٰۃ۔ مشکوٰۃ۔ النجوٰۃ۔ الربوٰۃ اور منوٰۃ۔ ان میں سے بعض معرف باللام یا اس کے بغیر (نکرہ) دونوں طرح قرآن میں آتے ہیں اور بعض خاص لفظوں کے بارے میں استثناء یا اختلاف اپنی جگہ بیان ہوگا۔

۲:۵۹:۴ الضبط

اس قطعہ کے کلمات کے ضبط میں تنوع زیادہ تر ساکن حرف علت، نون مخفاۃ، ہمزۃ الوصل الف محذوف، ہائے کنایہ، اسم جلالت اور اقلاب نون میم کے ضبط میں منحصر ہے۔ اس کے علاوہ افریقی مصاحف میں ف اور ق کے اعجام میں فرق اور نون متطرفہ کا عدم اعجام قابل غور ہے۔ حسب ذیل نمونوں میں اس کی توضیح موجود ہے۔ جہاں صرف حرکات کی شکل کا اختلاف ہے (یعنی ـَ ـِ ـُ کی بجائے ـــ ـــ ـــ) ان کو دوبارہ نہیں لکھا گیا۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ، النَّاسِ، اَلنَّاسِ، اَلنَّاسِ،

عَلٰی، عَلٰی/ حَیٰوۃٍ، حَیٰوۃٍ/ وَمِنَ، مِنَ/ اَلَّذِیْنَ، اَلَّذِیْنَ، اَلَّذِیْنَ، اَلَّذِیْنَ/ اَشْرَکُوْا، اَشْرَکُوْا/ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ، اَحَدُھُمْ/ لَوْ یُعَمَّرُ/ اَلْفَ، اَلْفَ، اَلْفَ/ سَنَۃٍ/ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِہٖ، بِمُزَحْزِحِہٖ/ مِنَ، مِنَ/ اَلْعَذَابِ، اَلْعَذَابِ/ اَنْ، اَنْ، اَنْ/ یُّعَمَّرَ، یُّعَمَّرَ/ وَاللّٰہُ، اَللّٰہُ، اَللّٰہُ/ بَصِیْرٌ، بَصِیْرٌ، بَصِیْرٌ، بَصِیْرٌ/ بِمَا، بِمَا/ یَعْمَلُوْنَ، یَعْمَلُوْنَ، یَعْمَلُوْنَ۔

○ ○ ○

بقیہ حواشی منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں

{۱۷} ابن قیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۴۲

{۱۸} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۴۲

{۱۹} ابن قیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۹۲

{۲۰} ابن قیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۷۴

{۲۱} ایضاً' ج ۴' ص ۱۹۱ و الموافقات للشاطبی' ج ۴' ص ۱۷۲

{۲۲} ابراہیم اللقانی' اصول الفتویٰ ص ۱۸۷ (مخطوطہ)

{۲۳} ابن القیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۵۰

{۲۴} القرافی' الاحکام فی التمییز بین الفتاویٰ والاحکام' ص ۱۷۲

○ ○ ○ ○

پیش رفت

سالانہ رپورٹ شعبہ خط و کتابت کورسز

برائے سال ۱۹۹۶ء

مرتب : انوار الحق چوہدری' ناظم شعبہ

۱۔ شعبے کا اجراء

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر مؤسس انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی کی دعوت "رجوع الی القرآن" کی متعدد جہتیں (Facets) ہیں۔ عوام کے لئے ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن اور خطبات جمعہ' قرآن کالج میں نوجوان طلبہ کے لئے یونیورسٹی کورسز یعنی ایف اے' بی۔ اے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم یعنی عربی گرامر' قرآن اور حدیث کی تعلیم' عمر رسیدہ اور serving احباب کے لئے عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک سالہ کورس' تجوید سیکھنے کے لئے سپیشل کلاسز' بچوں کے حفظ قرآن کے لئے جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں شعبہ حفظ قرآن وغیرہ۔

ان سب کے علاوہ ایسے طلبہ و طالبات' خواتین و حضرات جو ملک سے یا لاہور سے باہر ہیں یا جن کے لئے کسی وجہ سے قرآن کالج / قرآن اکیڈمی لاہور میں حاضری ممکن نہیں' خط و کتابت کورسز ترتیب دیئے گئے ہیں' تاکہ سب گھر بیٹھے بیٹھے سہولت کے ساتھ اپنے فارغ وقت میں عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کر سکیں اور درج ذیل کورسز سے استفادہ کر سکیں :

(i) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

(ii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ اول)

(iii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ دوم)

پہلے کورس کا آغاز جنوری ۱۹۸۸ء میں کیا گیا۔ اس کورس کا مقصد خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کو قرآن حکیم کے مربوط مطالعے کے ذریعے دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے

متعارف کرانا ہے۔ بفضل باری تعالیٰ یہ کورس خوب زور شور سے جاری ہے۔ اس میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۲۳۱۵ تک پہنچ چکی ہے۔ بیرون ملک سے اس کورس کا اجراء سعودی عرب میں جدہ' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' ریاض' دا ہران اور الواسیع میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ابوظبی' دوبئی' شارجہ' راس الخیمہ' انگلینڈ' فرانس' کینیڈا اور امریکہ میں بھی کورس کا اجراء ہو چکا ہے۔

دوسرے کورس (حصہ اول) کا اجراء نومبر ۱۹۹۰ء میں کیا گیا۔ قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کے لئے ابتدائی عربی گرائمر کا جاننا ناگزیر ہے۔ اس کورس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو عربی گرائمر کے بنیادی اصولوں سے اس حد تک متعارف کرا دیا جائے کہ قرآن اور احادیث سے براہ راست استفادہ کے لئے انہیں ایک بنیاد حاصل ہو جائے۔ اول الذکر کورس کی طرح یہ کورس بھی بہت مقبول ہوا۔ اس کے طلبہ اور طالبات کی تعداد ۱۳۹۹ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ کورس بھی بیرون پاکستان سعودی عربیہ' ابوظبی' دوبئی' شارجہ' انگلینڈ' فرانس' کینیڈا اور امریکہ میں جاری ہو چکا ہے۔

اس کورس کے حصہ دوم کا آغاز بھی اکتوبر ۱۹۹۲ء میں کر دیا گیا تھا۔ اس میں طلبہ کی تعداد ۱۴۵ تک پہنچ چکی ہے۔

۲ ۔ ترجمہ قرآن کریم کورس

۱۹۹۶ء کے دوران شعبہ خط و کتابت کورسز میں ایک نئے کورس بعنوان "ترجمہ قرآن کریم" کورس کا اجراء کیا گیا۔ یہ کورس خاص طور پر youngsters کے لئے جاری کیا گیا ہے' یعنی سکول اور کالج کے طلبہ و طالبات جو اردو لکھ پڑھ سکتے ہوں۔ ان طلبہ اور طالبات کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اور یہ الفاظ کا ترجمہ باسانی یاد کر سکتے ہیں۔

آج کل کے مادی دور میں زندگی کا مقصد دنیا کا حاصل کرنا ہی بنا لیا گیا ہے۔ جس دن سے ہمارے ہاں اولاد ہوتی ہے اس کے لئے ہماری بڑی سے بڑی کوشش اور خواہش کیا رہنے لگتی ہے؟ یہی نا کہ یہ اونچی سے اونچی ڈگری حاصل کرے' اونچے سے اونچے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمت حاصل کرے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر والدین

اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو اندھا دھند انگلش سکولوں' پروفیشنل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جھونک دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نئی نسل قرآن' سنت اور شعائر اسلام سے بالکل کوری رہ جاتی ہے۔ جن گھروں میں والدین باقاعدگی سے نمازیں ادا کرنے والے اور تلاوت قرآن کرنے والے ہوتے ہیں' ان کی اولاد انگلش سکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے دین (قرآن۔ نماز) سے بالکل بے بہرہ ہو جاتی ہے۔

ایسے نوجوان بچوں اور بچیوں کو ترجمہ قرآن سکھانے کے لئے ایک طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ ایسے بچے اور بچیاں اپنے گھر میں فارغ وقت میں روزانہ دس پندرہ منٹ صرف کر کے قرآن کریم کا ترجمہ سیکھ سکتے ہیں۔ گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ٹیوٹر کی ضرورت نہیں۔ ٹیوشن فیس دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ دین دار والدین جنہوں نے کسی وجہ سے اب تک اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم دینے کی طرف توجہ نہیں دی وہ صرف تھوڑی سی توجہ کر کے اپنے بچوں بچیوں کو اس طریقہ کے مطابق قرآن کریم کا ترجمہ سکھا سکتے ہیں۔ انہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ بچے روزانہ دس پندرہ منٹ اس کام کے لئے صرف کریں گے اور ناغہ نہیں کریں گے۔

تدریس : قرآن کریم میں تقریباً اسّی ہزار (80,000) الفاظ ہیں' مگر اصل الفاظ کل دو ہزار ہیں' جو بار بار آنے کی وجہ سے اسی ہزار (80,000) کی تعداد تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان ۲ ہزار (2,000) الفاظ میں بھی تقریباً (500) پانچ سو الفاظ وہ ہیں جو اردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بار بار استعمال ہونے والے الفاظ کتابچہ ترجمہ قرآن میں دے دیئے گئے ہیں۔ طلبہ اور طالبات نے ان الفاظ کو یاد کرنا ہے۔ بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ انہیں لکھ کر خوب ذہن نشین کر لیا جائے۔ ورنہ انہیں رٹ کر یاد کر لیا جائے۔ جب یہ الفاظ خوب یاد ہو جائیں تو بچے "ترجمہ قرآن کریم" پہلے پارہ سے شروع کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے حافظ نذر احمد صاحب کا ترجمہ recommend کیا جاتا ہے۔ ترجمہ قرآن کریم' کورس کی تدریس' نصاب' طریقہ امتحان' تعلیمی استعداد' اور کورس کے دورانیہ کے لئے پراسپکٹس کی طرف رجوع کریں۔ اس کورس کے اختتام پر کامیاب طلبہ و طالبات کو سند جاری کی جاتی ہے۔ اس کورس کی فیس

بہت کم یعنی صرف ۵۰ روپے رکھی گئی ہے۔

اس کورس کا اجراء فروری ۱۹۹۶ء سے کیا گیا۔ اب تک اس کورس میں ۱۳۷ طلبہ اور طالبات داخلہ لے چکے ہیں۔

۳ ۔ ان کورسز کو متعارف کرانے کے لئے اقدام

سال ۱۹۹۶ء کے دوران ان دونوں کورسز کو بڑے پیمانہ پر متعارف کرانے کے لئے مندرجہ ذیل اقدام کئے گئے :

۱ ۔ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے اپنے ماہانہ جرائد "حکمت قرآن" اور "میثاق" میں وقفہ وقفہ سے ان کورسز کے اشتہارات شائع کئے گئے۔

۲ ۔ ان کورسز کو پبلک میں متعارف کرانے کے لئے روزنامہ "نوائے وقت" اور "جنگ" میں سال میں دو دفعہ اشتہارات دیئے گئے۔

۳ ۔ ماہنامہ "کوثر" میں بھی ان کورسز کے بارے میں اشتہارات شائع کرائے گئے۔

۴ ۔ تنظیم اسلامی کے ۲۳ اسرہ جات کے نقباء اور ۷ امراء کو ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز نے ذاتی خط لکھے کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں ان کورسز کو متعارف کرائیں۔ انہیں کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی مندرجہ ذیل شہروں' ملکوں میں ارسال کئے گئے۔

اندرون ملک : کراچی' کوئٹہ' ملتان' فیصل آباد' لاہور' گجرات' راولپنڈی' اسلام آباد' پشاور' سکھر' چکوال' سرگودھا' شجاع آباد' وہاڑی' بورے والا' بہاولپور' رحیم یار خان' میرپور خاص۔

بیرون ملک : ۱۔ سعودی عرب میں مکہ مکرمہ' جدہ' مدینہ منورہ' ریاض' دہران' الواسیع' ۲۔ ابوظبی' ۳۔ دوبئی' ۴۔ شارجہ' ۵۔ راس الخیمہ' ۶۔ انگلینڈ' ۷۔ فرانس' ۸۔ کینیڈا' ۹۔ امریکہ

ان نقباء اور اسرہ جات کو ہر چھ ماہ کے بعد یاد دہانی کرائی گئی اور پراگریس رپورٹیں بھی منگوائی گئیں۔

۵ ۔ ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز نے اپنے احباب اور ہم خیال دوستوں کو ان کورسز سے

متعارف کرانے کے لئے ذاتی خطوط بھی تحریر کیے۔

۶ - لاہور کی مندرجہ ذیل بڑی بڑی لائبریریوں کے انچارجز کو ان کورسز کے بارے میں خط لکھے گئے۔ ان سے استدعا کی گئی کہ ان کورسز کے اشتہارات اپنی لائبریریوں کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیے جائیں۔ انہیں اشتہارات، کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی بھجوائے گئے :

ا) پنجاب پبلک لائبریری

ب) پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

ج) دارالسلام لائبریری باغ جناح لاہور

د) قرآن محل، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

۴ - موازنہ

۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء کے موازنہ کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں :

	۱۹۹۵ء	۱۹۹۶ء
(ا) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس :		
(ا) دوران سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۵۰۹	۳۹۵
(ب) دوران سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۶۹	۵۸
(۲) عربی گرائمر کورس (حصہ اول)		
(ا) دوران سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۲۹۱	۲۴۰
(ب) دوران سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۴۱	۳۸
(۳) عربی گرائمر کورس (حصہ دوئم)		
(ا) دوران سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۴۵	۳۱
(ب) دوران سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۳۰	۲۴
(۴) ترجمہ قرآن کریم کورس :		

سال ۹۶ء میں اس کورس میں ۱۳۷ طلبہ / طالبات نے داخلہ لیا۔

○ ○

feudalism and absentee landlordism, and this require genuine land reforms.

Giving his advice about a number of administrative issues, Dr. Israr Ahmad said that:

1. national census must be performed at the earliest;
2. detailed statistics must be compiled about the number of adherents of various schools of thought, as this will be a practical issue in the implementation of the *Shari'ah*, especially concerning the personal law;
3. Presidential system should be adopted by open and constitutional means and not by the back door;
4. provinces should be re-arranged and smaller provinces should replace the present setup, inlcuding new nomenclature for the provinces;
5. the Council for Defense and National Security (CDNS) should be disbanded;
6. Arabic language should be made compulsory at the high school level;
7. the Judiciary and the Executive should be totally separated right down to the lowest level; development funds for the MNAs and other avenues for political corruption should be eliminated;
8. the Federally Administered Tribal Areas (FATA) should be completely integrated with the federation of Pakistan;
9. written-off loans should be recovered;
10. obscene and otherwise un-Islamic shows should not be allowed to go on-air from the Pakistan Television, and the use of Satellite Dish should be prohibited; and
11. reforms should be introduced to eradicate the vulgar display of wealth in the wedding ceremonies.

Giving his advice regarding foreign affairs, Dr. Israr Ahmad said that:

1. Pakistan should recognize the Taliban government in Afghanistan and play its role in bringing about a reconciliation between Iran and the Taliban;
2. the achievement of Shi'ah-Sunni harmony and of a united Islami Bloc between Pakistan, Iran, and Afghanistan are also essential if we are resist the hegemony of the New World Order;
3. Pakistan should use the good offices of Iran and China to bring about a settlement of the Kashmir problem under the Simla agreement;
4. trade between India and Pakistan should also be encouraged; and
5. Pakistan should play an active role to help control the situation in the Chinese province of Xinjiang, so as to prevent the further advance of the "Huntington Doctrine."

Giving his advice to the new government, Dr. Israr Ahmad said that:

1. total and unconditional supremacy of the Qur'an and the Sunnah at all levels should be made a constitutional imperative;
2. all clauses in the Constitution which are in conflict with the Objectives Resolution should either be removed or made subordinate to the latter;
3. the status of the Federal Shariat Court should be raised, and its judges should be given a status equal to those of the High Court;
4. the Federal Shariat Court must be allowed to function without any restrictions.

Dr. Israr Ahmad said that due to the stagnation in the process of Islamic legislation and *Ijtihad* during the last one thousand years, there are considerable chances on the part of both the Federal Shariat Court and the Supreme Court's Shariat Appellate Bench of committing mistakes in their interpretation of the Qur'an and the Sunnah. As such, we need to have a greater latitude for review and re-examination of their decisions and judgments, as compared to other courts. Dr. Israr Ahmad said that Pakistan will become an Islamic State, at least on the constitutional level, provided Mr. Nawaz Sharif's government can take these bold steps. The Ameer of Tanzeem-e-Islami also demanded that the government should either withdraw its appeal in the Supreme Court's Shariat Appellate Bench against the Federal Shariat Court's judgment regarding *Riba* (Interest), or it should expedite the proceedings of the appeal so that the case is decided as soon as possible. Dr. Israr Ahmad said that it is the government's responsibility to develop an alternate *Riba*-free economic model, and that it has the recourses to summon the experts in Islamic Economics from all over the world and request them to develop such a model.

Regarding the menace of feudalism and absentee landlordism in Pakistan, Dr. Israr Ahmad said that Mr. Nawaz Sharif should form a high-powered land commission consisting of eminent and learned scholars of the Islamic law, having the capability of *Ijtihad*, as well as experts in land settlement. This commission should decide whether the agricultural lands in Pakistan are "Usheri" or "Kharaji," that is, whether they are the private property of the landlords or public property, to be used for the welfare of the entire population. Moreover, this commission should settle the issue of whether absentee landlordism — or *Muzare'at* and *Thaika* — is permissible in the *Shari'ah*, as the practice of crop-sharing was considered Haram (prohibited) by Imam Abu Hanifa, Imam Malik, and Imam Shafa'ee. Dr. Israr Ahmad said that no improvement in the economic condition of the masses is possible without the eradication of

government will be able to negotiate with foreign powers from a position of strength rather than one of weakness.

Instead of genuine and ideal Islamic democratic traditions, we have in Pakistan only a crude imitation of Western democracy. Even though the present setup is far from ideal, the presence of two strong political parties is a must for the proper running of this system. The massive mandate received by the PML has given rise to the threat of one-party dictatorship. Under the present conditions, therefore, the Pakistan People's Party should be re-organized on sound foundations so that it can effectively play the role of Opposition. Otherwise, absolute and unchecked authority would only lead to unprecedented corruption. The Bhutto era, however, is clearly over for the PPP. Ms. Benazir Bhutto should seriously think about giving up the party chairpersonship, and the older associates of Zulfiqar Ali Bhutto should bring about a change in the leadership of the party from within. The slogan of "Roti, Kapra, Makan" raised by ZAB actually represents a fundamental Islamic imperative, as it is the basic duty of the System of *Khilafah* (or an Islamic state) to take care of the basic necessities of all the citizens. The slogan was absolutely right, though the leader failed miserably in implementing it.

Dr. Israr Ahmad pointed out that the absence of any reference to Islam in the PML's election campaign is a very dangerous indicator. The Westernized and secular elements can now claim that the people have rejected the Islamic option, and that the election results are actually a mandate against religion; indeed, the Indian press has celebrated this aspect of the election results, intrepreting it as a defeat and failure of Islamic fundamentlism. Although it may be argued that the people did not have a real choice, that PML was only the lesser of the two evils, that no notable religious party was taking part in the elections, or that the voters have become disappointed with the politico-religious parties because of their wrong approach and mutual disharmony. The massive mandate received by the PML is, however, a great test for Mr. Nawaz Sharif and his associates as well as for the Pakistani Muslims. Islam represents the only justification for Pakistan's existence and its stability, and secularism is not a wise choice as this would deprive Pakistan of its very *raison d' être*. Dr. Israr Ahmad said that he is in favor of encouraging trade with India; however, if the prevailing restrictions on trade and communication between India and Pakistan are relaxed without first strengthening the Islamic identity of our homeland, the inevitable result would be the devouring of the smaller country by the bigger one; thus the adoption of a secular polity in Pakistan would be suicidal.

MEMORANDUM

Presented to

Mian Muhammad Sharif, Mian Nawaz Sharif Mian Shabaz Sharif and Mian Abbas Sharif

On the occasion of their visit to
Quran Academy on February 23, 1997

Summary of the Friday Sermons delievered in Darussalam Mosque at Bagh-e-Jinnah (Lahore), on February 14 & 21, 1997, by Dr. Israr Ahmad, Ameer of Tanzeem-e-Islami

Although the Islamic System of Social Justice can never be established in Pakistan by taking part in the elections, but only by means of a disciplined and non-violent resistance movement, yet the political process itself must be allowed to continue and elections must be held on a regular basis. Pakistan came into being in the name of Islam, but indepence was achieved through democratic process. In view of the impediments that are faced by Muslim revivalists in countries like Saudi Arabia, Algeria, Turkey, and Libya, it is obvious that the presense of democracy and democratic rights in Pakistan constitute a great asset from the perspective of Islamic Revivalism too. There are a number of positive points regarding the February 3 elections, for which we should be thankful to Almighty Allah, but there is also a dark side of the picture which must not be ignored.

Describing the positive and auspicious points about the February 3 elections, Dr. Israr Ahmad mentioned the fact that everything from November 5 onwards was done within the bounds of the Constitution, that the election reforms introduced by the Caretakers had highly desirable effects on the election campaign, that the polling itself was totally fair and impartial, and that the immediate reactions by Ms. Benazir Bhutto and Qazi Hussain Ahmad were not hostile or belligerent. Dr. Israr Ahmad said that the Pakistan Muslim League has received an unexpectedly massive mandate from the people, which represents the revival of both the Muslim League and that of the dynamism of Pakistan movement. Such a massive mandate means that the MNAs would not be able to blackmail the government, that a strong and stable government can encourage a great amount of industrial development, and that the

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عصرِ حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے
قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان

کے چار جامع خطبات کا مجموعہ' بعنوان :

خطبات خلافت

سفید کاغذ' صفحات : 212' قیمت : 50 روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

1924ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے 1969ء تک
عالم اسلام کے کسی متحد نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کے جائزہ پر مشتمل ایک تاریخی
دستاویز جو گوشہ خلافت کے عنوان سے ندائے خلافت میں بالاقساط شائع کی جاتی رہی

استنبول سے رباط تک

تالیف :

عمران این حسین

ترجمہ و تلخیص از محمد سردار اعوان

تقدیم از قلم ڈاکٹر اسرار احمد

سفید کاغذ' صفحات : 110' قیمت : 30 روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور